اسلام اور سیاست

آیت اللہ مصباح یزدی مدظلہ العالی

مترجم

القائم گروپ

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ

قرآن سینٹر ۲۴۔الفضل مارکیٹ۔اردو بازار۔لاہور

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب	:	**اسلام اور سیاست**
تصنیف	:	حضرت آیت اللہ مصباح یزدی مدظلہ العالی
مترجم	:	القائم گروپ
پروف ریڈنگ	:	مجاہد حسین حرؔ
کمپوزنگ	:	قائم گرافکس۔ جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس کراچی 0345-2401125
ناشر	:	مصباح القرآن ٹرسٹ۔ لاہور۔ پاکستان
تعداد	:	ایک ہزار (۱۰۰۰)
طبع	:	اوّل۔ ۱۴۳۳ھ
قیمت	:	

ملنے کا پتہ

مصباح القرآن ٹرسٹ

قرآن سینٹر ۲۴۔ الفضل مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

انتساب

نجات دہندہ بشریت

حجۃ اللہ علی الخلق

حضرت صاحب العصر الزمان

عجل اللہ فرجہ الشریف

کے نام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کی ان صدقاتِ جاریہ میں سے ہے جس سے لوگ تا قیامت استفادہ کرتے رہیں گے اور موصوف کے درجات عالیہ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مصباح القرآن ٹرسٹ نے تراجم و تفاسیر قرآن سے کام شروع کیا اور پھر ہر وہ کتاب جس کی ملت کو ضرورت تھی شائع کی، انشاء اللہ العزیز آئندہ بھی شائع ہوتی رہیں گی۔

موجودہ کتاب ''**اسلام اور سیاست**'' حضرت آیت مصباح یزدی کی چالیس تقاریر کا مجموعہ ہے آقائی محترم نے علامہ اقبال کے اس شعر کی ایک خوبصورت تشریح کی ہے: ''جدا ہو گر دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی''

ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب انشاء اللہ آپ کو پسند آئے گی۔

یاد رہے کہ مصباح القرآن نے اپنی تمام کتابیں آپ کے استفادہ کے لئے انٹرنیٹ پر دے دی ہیں۔ ایڈریس ہے:

www.misbahulqurantrust.com

www.misbahulqurantrust.org

قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر وہ اس کتاب میں کہیں خامی دیکھیں یا کمی محسوس کریں تو ہمیں مطع ضرور فرمائیں ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ ادارہ کے ترقی اور اس کے بانی محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کے طالب ہیں۔

ادارہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

تقریظ

حجۃ الاسلام مولانا سید شہنشاہ حسین نقوی

ہمارا معاشرہ سیاست کے لفظ سے خوب آشنا ہے تصور میں مطلب خدمت انسانیت کم اور مطلب پرستی زیادہ لیا جاتا ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ موجودہ زمانے میں سیاست ایک بہت ہی بری چیز سمجھی جانے لگی ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہی کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر علامہ اقبال نے کہا تھا:

جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہی بات آج کے زمانے میں حضرت امام خمینیؒ نے ثابت کر کے دکھائی کی کہ سیاست وہی ہے جو دین ہے اور دین وہی ہے جو سیاست ہے مگر سیاست برائے سیاست سیاست نہیں بلکہ سیاست برائے ترویج دین اور خدمت انسانیت ہونی چاہئے اور سیاست پر دین کا حاکم ہو اور سیاست پر دین کو حاکم ہونا ہی سیاست کی بہترین تصویر ہے۔

حضرت آیت اللہ محمد تقی مصباح یزدی ایران کی علمی و سیاسی و سماجی مشہور و معروف شخصیت ہیں یہ کتاب آقائی مصباح یزدی کی چالیس تقاریر کا مجموعہ ہے ان تقاریر میں انہوں نے نہ صرف یہ کہ اسلامی سیاست کے خدوخال کو واضح کیا بلکہ دنیاوی و یورپی سیاست کے مکروہ چہرے سے نقاب نوچ ڈالی۔ آقائی مصباح یزدی پہلی تقریر سے جو گفتگو شروع کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ اب کوئی اور کام نہیں بلکہ اسی کتاب کو پورا کر کے اٹھنا ہے کیونکہ کتاب شروع کرنے کے بعد اس کو چھوڑنا بڑا مشکل نظر آتا ہے۔

اس کتاب کے عنوان ہی ایسے ہیں جنہیں دیکھ کر کتاب خود پکارتی ہے کہ مجھے ضرور پڑھو۔

اسلام اور اس کا سیاسی نظریہ

اسلامی حکومت میں لوگوں کا کردار

اسلام کے سیاسی نظریہ کو پہچاننے کے طریقے

اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کی اہمیت اور ضرورت

دشمن کی سازشوں کے مقابلے میں ہمارا وظیفہ

دین میں سیاست کی اہمیت

اسلام میں آزادی

اسلام کے سیاسی نظریہ کے اصول

اقدار کے بارے میں اسلام اور مغربی تمدن میں نظریاتی فرق

قانون کے سلسلے میں اسلام اور یورپ کے درمیان بنیادی فرق

حکومت اور سیاست کے سلسلہ میں اسلام کی خصوصیت

حقیقت یہ ہے کہ آقائی مصباح یزدی کی کتاب کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ یہ ہمارے لئے سعادت کا مقام ہے کہ ہمیں آقائی مصباح یزدی کی کتاب پر کچھ لکھنے کا موقع ملا ورنہ حقیقت یہی ہے کہ وہ استاد اور ہم ایک ادنیٰ طالب علم کا درجہ رکھتے ہیں۔

علمی اعتبار سے یہ کتاب اتنا عظیم سرمایہ ہے جسے اردو زبان پڑھنے والوں کے لئے پیش کرنا خود بہت بڑا کارنامہ و سعادت مندی ہے اور اس کا عنوان مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور کے روح رواں جناب شیخ محمد امین صاحب کو جاتا ہے جو اپنے اس عظیم مقصد سے اتنے سچے ہیں جس پر فخر کرنے کو دل کرتا ہے امید ہے کتاب ھٰذا اہل علم و دانش کے لئے ایک ذخیرہ علمی قرار پائے گی۔

والسلام

سید شہنشاہ حسین نقوی

فہرست کتاب

عنوان	صفحہ نمبر
مختصر تعارف	27
حضرت آیت اللہ محمد تقی مصباح یزدی	27
پہلی نشست	29
اسلامی سیاست کے سلسلے میں چند اہم سوالات	29
1۔ مقدمہ	29
2۔ اسلام اور اس کا سیاسی نظریہ	30
3۔ اسلامی سیاسی نظریہ کا بنیادی ہونا	31
4۔ اسلامی حکومت کی حقیقت اور اس کے ارکان	32
5۔ اسلامی حکومت کا ڈھانچہ، اس کے اختیارات اور وظایف کی وسعت	33
6۔ اسلامی حکومت میں لوگوں کا کردار اور چند دیگر سوالات	34
7۔ اسلام کے سیاسی نظریہ کو پہچاننے کے طریقے	35
اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کی اہمیت اور ضرورت	36
دوسری نشست	37
اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کی اہمیت اور ضرورت	37
1۔ اسلامی انقلاب سے مغرب و مشرق کا برتاؤ	37

عنوان	صفحہ نمبر
اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کی اہمیت اور ضرورت	37
2۔ جوانوں کی گمراہی کے لئے مغرب کا ایک ثقافتی حربہ	38
اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کی اہمیت اور ضرورت	38
3۔ فرہنگی تین حربے	39
الف: دین کو سیاست سے جدا کرنے کی فکر رائج کرنا	39
اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کی اہمیت اور ضرورت	39
ب: ولایت فقیہ کا انکار	40
اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کی اہمیت اور ضرورت	40
ج۔ ولایت فقیہ کو مورد اعتراض قرار دینا	41
اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کی اہمیت اور ضرورت	41
4۔ دشمن کی مذکورہ سازشوں کے مقابلے میں ہمارا وظیفہ	42
اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کی اہمیت اور ضرورت	42
5۔ دشمن کی سازشوں کے مقابلہ میں بہترین راستوں کا انتخاب	43
اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کی اہمیت اور ضرورت	43
6۔ دین کی تعریف اور اس کی حدود	44
اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کی اہمیت اور ضرورت	44
اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کی اہمیت اور ضرورت	45
7۔ دینی طریقوں سے دینی معرفت کی ضرورت	46
اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کی اہمیت اور ضرورت	46
اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کی اہمیت اور ضرورت	47
تیسری نشست	49
دین میں سیاست کی اہمیت (پہلا حصہ)	49
1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر	49

عنوان	صفحہ نمبر
2۔سیاست کی تعریف اور اسلام میں تین طاقتوں کی اہمیت	50
3۔عدالتی احکام قرآن کی نگاہ میں	52
4۔سلام کا ہمہ گیر ہونا اور اسلامی حاکم کی اہمیت	54
5۔مذکورہ بحث کا خلاصہ	57
چوتھی نشست	59
دین میں سیاست کی اہمیت (دوسرا حصہ)	59
1۔گذشتہ مطالب پر ایک نظر	59
پہلا اعتراض:	59
2۔کیا دین سیاست سے جدا ہے؟ (مذہبی وغیر مذہبی لوگوں کا نظریہ)	60
3۔دنیا اور آخرت میں چولی دامن کا رابطہ ہے	61
4۔انسان کے دنیاوی اعمال وکردار کی اہمیت	64
5۔انسان کے کردار کی اہمیت کو سمجھنے میں عقلی طاقت کی شعائیں	65
6۔دین کی حدود	66
7۔دین اور حکومت میں رابطہ	67
8۔دین کی جامعیت	69
پانچویں نشست	70
اسلام میں آزادی (پہلا حصہ)	70
1۔گذشتہ مطالب پر ایک نظر	70
2۔علم اور دین کے مخصوص دائرے	70
3۔دینی حاکمیت کا آزادی سے ٹکراؤ، ایک شبہ	71
4۔مذکورہ شبہ دینی انداز میں	71
مذکورہ اعتراض کا جواب	72
5۔قرآن پر مختلف توجہ کی دلیل	73

عنوان	صفحہ نمبر
6۔مذکورہ شبہ غیر مذہبی طریقہ سے	77
7۔"ھیوم" کے اعتراضات اوران کے جوابات	78
8۔دوسرا جواب: آزادی مطلق اور لامحدود نہیں ہے	78
9۔حاکمیت اورانسان کے خلیفۃ اللّٰھی عظمت کے درمیان تعارض ایک شبہ	79
اعتراض کا جواب	79
1۔اسماء کا علم	80
2۔اللہ کا خلیفہ روئے زمین پر عدالت وانصاف کو جاری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو	80
چھٹی نشست	82
اسلام میں آزادی (دوسرا حصہ)	82
1-تاریخ انسان میں تحویل وتحول کی بنا پر ایک شبہ	82
2-ہمارا جواب	83
تشریعی لحاظ سے دوسرا جواب	84
3-گذشتہ اعتراض، ایک دوسرے لحاظ سے	85
4-ہمارا جواب	85
5۔خدا کی نافرمانی تاریخ کی نظر میں	86
6-خدا کی اطاعت اور آزادی	88
ساتویں نشست	92
آزادی کی حدود	92
1-اسلام کا سیاسی نظریہ اور آزادی کو محدود کرنے کا شبہ	92
2-آزادی کے بارے میں مختلف نظریات	93
3۔آزادی، مطلق نہیں ہے، اور آزادی کے دین پر مقدم ہونے کا جواب	95
4۔ہر معاشرے کی مقدسات کی رعایت ضروری ہے۔	96
5-آزادی کے نعرہ میں ناجائز غرض	98

عنوان	صفحہ نمبر
6۔آزاد گفتگو کی حدوحدود	99
7-الفاظ کے مفہوم اور مصادیق کو روشن کرنے کی ضرورت	100
آٹھویں نشست	102
حکومت کے ڈھانچے کی وضاحت	102
1۔عنصری اور مصداقی تعریف کی اہمیت	102
2-اسلام اور تینوں قوتوں کے جدا جدا ہونے کا نظریہ	103
الف۔قوۂ مقننہ:	103
ب۔قوہ قضائیہ:	104
ج-قوہ مجریہ:	104
3۔اسلام معاشرہ کو ادارہ نہیں کرسکتا (ایک شبہ)	105
4-قوانین کی مختلف اقسام اور متغیر قوانین ہونے کی ضرورت	106
الف۔قانون اساسی	106
ب۔پارلیمینٹ کے بنائے گئے قوانین	107
ج۔انجمنِ حکومت کے بنائے گئے قوانین	107
5-قوانین کا اسلامی ہونے کا مطلب	108
6-اسلامی حکومت میں قانون گذاری کا مسئلہ	110
7-اسلامی حکومت میں قانون کے جاری کرنے والوں کو منصوب کرنا	111
نویں نشست	113
دینی نظام میں قوانین کا مقام	113
1-اسلام کے سیاسی نظریہ کے اصول	113
الف۔قانون	113
2-طبعی اور بنائے گئے قوانین کی اھیمت	114
ب-قوانین کا مرضی الٰہی اور دین کے مطابق ہونا ضروری ہے	116

عنوان	صفحہ نمبر
3-دین کی ضروری باتوں کو قبول کرنا لازمی ہے	117
4-اسلام، اصول اور ثابت معرفتیں	118
5-قرآن کریم کے ثابت اور قطعی احکام ومفاہیم	120
6-اسلام مختلف تعبیریں رکھتا ہے (ایک اعتراض اور اس کا جواب)	122
7-اسلام انسان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتا ہے	123
الف: سوال کے ثبوتی پہلو کی تحقیق	123
ب:-سوال کے اثباتی پہلو	123
دسویں نشست	125
قانون کے سلسلہ میں نظریات میں فرق	125
1-گذشتہ مطالب پر ایک نظر	125
2-دور حاضر میں قانون سے بحث کرنے کی ضرورت	126
3-قوانین کی حدود کو معین کرنے میں دو مختلف نظریے	126
4-جمہوری حکومت میں قانون کی ضرورت	127
5-حقوق بشر کے اعتبار کا معیار	128
6-حقیقی اور تکوینی قوانین اور انسان کے اختیارات کی اہمیت	130
7-الٰہی اور تشریعی قوانین، انسان کے کمال اور سعادت کی ضامن ہے	131
8-حقوقی قوانین اور اخلاقی قوانین میں فرق	134
9-اسلامی اور خودمختاری کے نظریات میں فرق	135
گیارہویں نشست	138
قانون کے اعتبار کا معیار	138
1-بڑے سیاسی مسائل کی عمیق تحقیق کی ضرورت	138
2-قانون کے معتبر ہونے کا معیار اور اس کی وسعت	139
الف: نظریۂ عدالت	140

عنوان	صفحہ نمبر
ب: معاشرے کی ضرورتوں کو پورا کرنا	140
ج: عوام الناس کیا چاہتی ہے	141
3۔ پہلے نظریہ پر اعتراض	142
4۔ اسلامی قوانین کی برتری	143
5۔ دوسرا نظریہ عملی نہیں ہے	144
6۔ تیسرے نظریہ کی کمی اور اسلامی لحاظ سے ضرورتوں کی وسعت	145
7۔ اسلامی انقلاب اور اس کا معنوی مصلحتوں سے برتر مقام	147
بارہویں نشست	149
اقدار کے بارے میں اسلام اور مغربی تمدن میں نظریاتی فرق	149
1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر	149
2۔ دین کی نظر میں بہترین قانون اور دوسروں کے نظریہ کے تحت تاثیر واقع ہونے کا خطرہ	150
3۔ دینی نظریات میں دوسروں سے متأثر ہونا	151
4۔ پلورالیزم دینی کا مطلب	153
5۔ بندگی خدا کی عظمت اور اس کا مطلق آزادی سے ٹکراؤ	155
6۔ یورپ اور علم و دین کے ٹکراؤ کا دور ہونا	158
7۔ اسلام اور آزاد یخواہ مکتب میں عوام الناس کی اہمیت	159
8۔ اسلام اور یورپ میں جمہوریت اور قانون گذاری کا مرجع	161
9۔ جوانوں کے لئے ایک نصیحت	164
تیرہویں نشست	166
قانون کے سلسلے میں اسلام اور یورپ کے درمیان بنیادی فرق	166
1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر	166
2۔ فردی آزادی اور قانون کے درمیان رابطہ	167
3۔ اومانیزم اور لیبرالیزم کا قانون میں داخل ہونا	169

عنوان	صفحہ نمبر
4۔ یورپی ثقافت کے اصول اور اسلامی ثقافت سے ان کا موازنہ	169
5۔ علماء اور اسلامی تالیفات کی ذمہ داریاں	171
6۔ قانون کی حقیقت اور اسلام اور لیبرالیزم میں اس کی اہمیت	172
7۔ مشروع آزادی کا نسبی ہونا	174
8۔ اسلام کا لیبرالیزم سے ٹکراؤ	174
9۔ اسلام اور ڈیموکراسی میں قانون گذاری	175
10۔ اسلامی حکومت میں معتبر قانون	177
چودہویں نشست	179
قانون کے سلسلے میں غرب کی مادی نگاہ	179
1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر	179
2۔ مکتب حقوق طبیعی	180
۳۔ یورپ میں حقوق بشر کی حدود	181
۴۔ آزادی کی حد بندی میں تعارض کا ظاہر ہونا	182
5۔ حقوق بشر میں آزادی کی اہمیت	183
6۔ یورپ میں آزادی کی حد بندی پر اعتراضات	184
7۔ مادی اور معنوی مصالح پر قانون اسلام کی توجہ	186
8۔ مصالح معنوی اور دینی کا مصالح مادی پر مقدم ہونا	188
۹۔ اسلام اور لیبرالیزم کے مابین آزادی اور قید میں فرق	189
پندرھویں نشست	190
اسلامی حکومت اور ثقافتی حربے	190
1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر	190
2۔ علماء اور ان کی خطرناک ذمہ داری	190
3۔ ملکی اخباروں میں مغربی غلط آزادی کی تبلیغ	193

عنوان	صفحہ نمبر
4۔اسلامی پروٹسٹانیزم، اسلام پر ایک حملہ	194
5۔حق مسلّم کا مفہوم حقیقی	195
6۔اسلام کی حقیقی قرائت اور اس کا صحیح مطلب	196
7۔شرعی آزادی	198
8۔دین اور قانون آزادی کو محدود کرتے ہیں۔	199
۹۔آزادی کو محدود کرنے کی ضرورت	201
سولہویں نشست	203
قانون اور آزادی کے لحاظ سے الٰہی اور والحادی ثقافت میں فرق	203
1۔انتخاب کی اہمیت اور ہدف تک پہنچنے کے لئے قوانین کی آگاہی اور رعایت	203
2۔اخلاقی اور حقوقی قوانین میں فرق	205
3۔الٰہی اور کفر والحاد کی ثقافت میں فرق اور قانون کے بارے میں اختلاف نظر	206
4۔مغربی ثقافت کے تین اہم رکن ہیں	207
5۔اسلامی اور مغربی تمدن کا بنیادی فرق	210
6۔آزادی کی حدود کو معین کرنے میں اسلام اور مغربی تمدن میں فرق	212
سترہویں نشست	216
ربوبیت تشریعی، حاکمیت اور قانون گزاری میں رابطہ	216
1۔گذشتہ مطالب پر ایک نظر	216
2۔اصول موضوعہ کو معین کرنے کی ضرورت	216
3۔خدا کی حاکمیت اور تشریعی الوہیت	218
4۔خالص توحید کا مطلب	221
5۔قانون گذار حضرات اور اسلام میں حاکمیت	221
6۔قانون گذاری حق خدا سے مخصوص ہونے کے دلائل	225
اٹھارہواں نشست	229

عنوان	صفحہ نمبر
قانون گذاری کے شرائط اور اسلام میں اس کی اہمیت	229
1۔گذشتہ مطالب پر ایک نظر	229
2۔قانون گذاری کے شرائط خداوند عالم میں منحصر ہیں	230
3۔قانون بنانے والے متعدد ہو سکتے ہیں (ایک اعتراض)	231
4۔گذشتہ اعتراض کا جواب	232
5۔قانون گذاری میں خدا کی اجازت بے اثر ہے (دوسرا اعتراض)	233
6۔گذشتہ اعتراض کا جواب	233
7۔کیا انسان اپنی زندگی پر حقِ حاکمیت رکھتا ہے؟	236
8۔انسان کی حاکمیت خدا سے نہیں ٹکراتی	238
انیسویں نشست	241
حکومت اور سیاست کے سلسلہ میں اسلام کی خصوصیت	241
1۔گذشتہ مطالب پر ایک نظر	241
2۔حکومت سے مخصوص کاموں کے بارے میں تین نظریے	242
3۔اسلامی اور غیر اسلامی حکومتوں کے کاموں میں ایک امتیازی فرق	244
4۔انسانی معاشرہ کی حقیقت اسلام کی نگاہ میں	245
5۔قانون گذار کی ضروری صفات	246
6۔اسلامی اور لیبرالیزم قوانین میں اختلاف	250
بیسویں نشست	254
قانون وحکومت کی ایک نئی تصویر	254
1۔معاشرہ پر ایک طبقاتی اور احزابی نظر	254
2۔معاشرہ کے طبقاتی اور احزابی نظام کے بارے میں اسلام کا نظریہ	255
3۔معاشرہ اور پیکر انسانی میں دیگر شباہتیں	256
4۔معاشرہ میں طبقاتی نظام کی روشنی میں حکومت کی اہمیت	258

عنوان	صفحہ نمبر
5۔ واقعی مصالح ومفاسد قانون کے پشت پناہ	261
اکیسواں جلسہ	263
اسلام اور جمہوریت (پہلا حصہ)	263
1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر	263
2۔ قانون کے جاری کرنے والوں کے لئے بھی اذن خدا ضروری	264
3۔ جمہوریت کے معنی اور اس کے استعمال میں ایک بحران	266
4۔ دور حاضر میں جمہوریت کا مفہوم	268
5۔ جمہوریت کی نئی تصویر سے استعمار کا بے جا فائدہ اٹھانا	269
6۔ اسلامی نظریہ کے مطابق جمہوریت کی مناسب تصویر	270
بائیسویں نشست	273
اسلام اور جمہوریت (دوسرا حصہ)	273
1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر	273
2۔ سیکولر جمہوری اور اس کے فلسفہ کی وضاحت	273
3۔ سیکولر نظام کی فلسفی بنیاد میں مغالطہ	274
۴۔ مدیریت کے میدان میں جمہوریت کا دوسرا رخ	276
5۔ جمہوری اسلامی میں اسلام وولایت فقیہ کا سب سے اہم مقام	278
6۔ اسلام کی مورد قبول جمہوریت	280
تئیسویں نشست	281
انسانیت میں اصل وحدت کی تحقیق اور شہریوں کی اتباع	281
1۔ اسلامی نقطہ نظر کسی کا صاحب حق ہونا	281
۲۔ تکالیف اور حقوق کے مابین طبیعی اور کسبی اختلاف کا اثر	283
(الف)۔ اختلافات طبیعی اور جبری	284
(ب) انسانوں کے مابین دوسرا اختلاف اختیاری ہے	285

عنوان	صفحہ نمبر
3۔افراد کے لئے شہریت کے قوانین میں مختلف درجات کا معین ہونا	286
4۔اسلام کی نگاہ میں پہلے اور دوسرے طبقہ کی شہریت	287
5۔نظام ولایت فقیہ کا دوسرے نظاموں سے فرق	288
چوبیسویں نشست	290
حکومت کی عظیم منصوبہ بندی (پہلا حصہ)	290
1۔حکومت کی ضرورت	290
2۔قوۂ مجریہ کے اہداف کے سلسلہ میں مختلف نظریات	291
3۔انبیاءؑ کی حکومت کے اغراض ومقاصد	294
4۔لیبرل ''Liberal'' (آزادی خواہ) نظام میں اجتماعی مشکلات کا اثر	295
5۔لیبرل نظام سے لوگوں کی انسیت کی دلیل	297
6۔اسلامی حکومت کے ڈھانچہ کے سلسلہ میں ایک طریقہ	298
1۔قانون کی شناخت:	298
2۔قوانین کو نافذ کرنے کی طاقت:	298
7۔عوام الناس میں حکومت کی مقبولیت ضروری ہے۔	299
پچیسویں نشست	301
حکومت کی عظیم منصوبہ بندی (دوسرا حصہ)	301
1۔گذشتہ مطالب پر ایک نظر	301
2۔حکومت، انسانی معاشرہ کی دائمی اور ہمیشگی ضرورت ہے۔	302
3۔حکومت کی ضرورت پر اسلام اور قرآن کا نظریہ	303
4۔طاقت وقدرت کی ضرورت	305
5۔مدیروں میں تقویٰ اور اخلاقی صلاحیت ہونا ضروری ہے	306
6۔فلسفہ سیاست میں حکومت کی مشروعیت	307
7۔حکومت کی مشروعیت کے سلسلہ میں اسلامی نظریہ کا لیبرل معاشرہ سے فرق	310

عنوان	صفحہ نمبر
چھبّیسویں نشست	314
حکومت کے مخصوص کام اور عوام الناس کے ھاتھ بٹانے پر اسلام کا زور	314
1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر	314
2۔ حکومت کے عظیم اور مخصوص کام	314
3۔ حکومت کے دوطرفہ وظائف	317
4۔ کم درآمد لوگوں کو مدد پہنچانے والی کمیٹیوں کی ضرورت	318
5۔ عوام الناس کی شرکت پر اسلام کی توجہ	320
6۔ عوام الناس کی شرکت کو کم کرنے والے اسباب	320
7۔ اسلام میں جامعہ مدنی کی اہمیت	321
8۔ اسلامی انتخاب کے معیار سے مخالفت کے نئے حیلے	322
9۔ اسلامی اصول اور اقدار کی حفاظت اور دشمن زمینہ سازی سے مقابلہ کی ضرورت	324
ستائیسویں نشست	326
اسلامی حکومت کی خاص پہچان	326
1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر	326
2۔ نظام اسلامی اور لائیک نظام میں حکومت کے سلسلہ میں بنیادی فرق	327
3۔ مغربی کلچر کے عاشق افراد کی طرف سے سیکولر حکومت کی پیش کش	328
4۔ اسلامی شعار کا حفظ اور رائج کرنا، حکومت کی ایک ذمہ داری	328
5۔ حکومت اور اس کے کرداری پہلو	329
6۔ "ٹوٹالیٹر" (Totalitair) اور "لیبرل" حکومت کا مڈل	330
7۔ اسلامی نظریہ کے تحت حکومت کیسی ہونا چاہئے	333
8۔ متحد حکومتوں کے نقائص	336
اٹھائیسویں نشست	337
اسلامی حکومت اور جائز آزادی اور اقدار کی رعایت کرنا	337

عنوان	صفحہ نمبر
1۔حکومت کی ضرورت پر ایک اشارہ	337
2۔انسانی کردار میں اصل اوّلی	339
3۔سزا دینے کے سلسلہ میں اسلام کا تربیتی پہلو	340
4۔حکومت کے مخصوص ثابت اور متغیر کام	342
5۔قوانین جاری کرنے کے طریقہ کار میں اسلامی اور غیر اسلامی حکومتوں میں فرق	343
انتیسویں نشست	346
اسلامی حکومت کی ذمہ داری کے بارے میں نظریات	346
1۔گذشتہ مطالب پر ایک نظر	346
2۔اسلامی حکومت کے عہدہ داروں کے شرائط	347
الف۔قانون کی پہچان	347
ب۔اخلاقی صلاحیت	348
ج۔مدیریتی مہارت اور تجربہ	348
3۔عہدہ داری کے شرائط کا نصاب معین کرنے کی ضرورت	349
4۔اخلاقی صفات کے بارے میں "کانٹ" کے نظریہ کی ردّ	350
5۔اقدار اور وظائف کے بارے میں اسلامی درجہ بندی نظریہ	351
6۔عبادت کے بھی مختلف درجات ہیں	352
7۔اسلامی حکومت کے درجہ بندی شدہ نمونے	353
8۔ولایت فقیہ کی حکومت پر عقلی دلیل	354
تیسویں نشست	357
اسلامی حکومت سے ولایت مطلقہ فقیہ کی نسبت	357
1۔گذشتہ مطالب پر ایک نظر	357
2۔اسلامی حکومت کے وظائف اور اختیارات کا برابر کا توسعہ	358
3۔حکومتی اختیارات سے ولایت مطلقہ فقیہ کی نسبت	359

عنوان	صفحہ نمبر
4۔مخالفین کی طرف سے ولایت مطلقہ کے بارے میں شک وشبہات	359
5۔اسلامی حکومت کا ڈھانچہ	360
الف۔اسلامی قوانین کی وسعت اوران کا نسخ نہ ہونا	361
ب۔اسلام کی طرف سے حکومت کے درجہ وار نمونے	362
6۔اسلامی نقطہ نظر سے "حکومت میں حکومت" کے نقشہ کی تاریخ	363
7۔حضرت امام خمینیؒ کی طرف سے "ولایت مطلقہ فقیہ" کا نقشہ	365
8۔مقبولہ (روایت) عمر بن حنظلہ سے ولایت فقیہ	366
9۔اسلام کی نظر میں تفکیک قوا (قدرت کا جدا جدا ہونا) کا جائزہ	369
10۔طاقت کے ایک ساتھ ہونے کا سبب	370
1۔پارلیمنٹری نظام	370
2۔ریاستی نظام	370
اکتیسویں نشست	372
تفکیک قوا (طاقتوں کی جدائی) کے نظریہ کی تحقیق اوراس پر نقد وتنقید	372
1۔گذشہ مطالب پر ایک نظر	372
2۔تفکیک قوا (قدرتوں کی جدائی) کے نظریہ کی تاریخی حیثیت	372
3۔تفکیک قوا نظریہ کے دلائل پر ایک نظر	373
4۔تفکیک قوا کو بالکل محدود کرنا ناممکن	375
5۔تینوں طاقتوں پر ایک ناظر اور ہم آہنگ کرنے والی طاقت کی ضرورت	377
6۔ولایت فقیہ معاشرہ کے اتحاد کا مرکز	378
بتّیسویں نشست	380
اسلامی نظام کے اعتقادی عظمت بیان ہونے کی ضرورت	380
1۔اسلامی حکومت کی تھیسز "The'sis" کی پہچان کے مختلف طریقے	380
الف۔مختصر شناخت:	380

عنوان	صفحہ نمبر
ب۔مخصوص اور علمی شناخت:	381
ج۔متوسط شناخت:	382
2۔قانون کی ضرورت اور اس کے خصوصیات پر ایک نظر	383
3۔قوانین جاری کرنے والے کے صفات پر دوبارہ ایک نظر	384
مذکورہ شرائط:	384
4۔اعتقادی اصول سے اسلامی حکومت کی تھیوری کا تعلق	385
5۔حکومت کے طولی (تحت) مراتب کی منطقی اور عقلی دلیل	387
6۔اسلامی حکومت کے سلسلہ میں چند سوالات	389
تینتیسویں نشست	391
اسلام اور حکومت کے مختلف نقشے	391
1۔اسلام کی طرف سے حکومتی سلسلہ میں کوئی طریقہ بیان نہیں کیا گیا (ایک اعتراض)	391
2۔مذکورہ اعتراض کا جواب، اور حکومت کی شکل کے سلسلہ میں اسلامی نظریہ	393
3۔حکومتی ثابت اور مسلم ڈھانچہ پیش کیا جانا ممکن نہیں	394
4۔حکومت کا عرفی اور دنیاوی ہونا اور قوانین اسلام کا ہم عصری ہونا (ایک اعتراض)	395
5۔مذکورہ اعتراض کا جواب، اور اسلام کے متغیر اور ثابت احکام کی نسبت	397
6۔انسانی، تمام مسائل میں احکام الٰہی کی وسعت	401
چونتیسویں نشست	404
اسلامی احکام کی عظمت اور اس کی دوسرے نظام پر برتری	404
1۔حکومت اور متغیر احکام سے اسلامی ثابت احکام کی نسبت	404
2۔احکام اولیہ اور احکام ثانویہ	405
3۔ڈیموکریٹک حکومتوں کے نقائص	408
4۔قدرتوں میں ہم آہنگ کرنے کے اسباب کا ہونا ضروری ہے	410
5۔ولایت فقیہ حکومت کو ہم آہنگ کرنے والی طاقت	411

عنوان	صفحہ نمبر
6۔دوسری حکومتوں پر ولایت فقیہ نظام کے امتیازات	412
الف۔اندورنی انسجام ویگانگت	412
ب۔روحی اور اندرونی نفاذ کی ضمانت	413
ج۔مقام رہبری میں شائستگی اور تقویٰ کے عالی ترین درجات کا ہونا	415
د۔انسانی معنوی اور واقعی مصالح کی رعایت	416
پینتیسویں نشست	418
قوانین اور حکومت سے آزادی کی نسبت	418
1۔حاکم کا نصب کرنا آزادی اور ڈیموکریسی سے مطابقت نہیں رکھتا۔(ایک اعتراض)	418
2۔تکوینی آزادی اور نظریہ جبر کی تحقیق اور ردّ	418
3۔معنوی اور اندورنی اقدار کا آزادی سے کوئی ٹکراؤ نہیں	420
4۔آزادی اور دینی وظائف کی نسبت	422
5۔حدود اور سزاؤں میں آزادی کی نسبت	425
6۔حکومت اور قوانین کے زیر سایہ مطلق طور پر آزادی نہیں ہوسکتی	426
7۔حاکمیت کا خدا سے متصل ہونا	428
چھتیسویں نشست	432
اسلامی قوانین قطعی طور پر جاری ہونے چاہئیں	432
1۔گذشتہ مطالب پر ایک نظر	432
2۔حکومت کی ضرورت اور انسان کی اجتماعی زندگی کا عکس العمل	432
3۔حکومت کی مشروعیت کے منشاء کی طرف ایک اشارہ اور ڈیموکریسی پر اشکالات	433
4۔اسلام میں حکومت کی مشروعیت اور اس کا قانونی ہونا	436
5۔انبیاء علیہم السلام اور عوام الناس کی ہدایت کا طریقہ	437
6۔عوام الناس کی ہدایت میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کی ضرورت	438
7۔الٰہی اقدار کی حفاظت اور مغربی کلچر سے روک تھام ضروری ہے	440

عنوان	صفحہ نمبر
8۔قوانین کو جاری کرنے اور دشمن نظام سے بھرپور مقابلہ	442
9۔سازش کرنے والوں اور زرخرید غلاموں کے مقابلہ میں عوام الناس کی ہوشیاری	444
سینتیسویں نشست	
تشدد کے سلسلہ میں ایک تحقیق	446
1۔گذشتہ مطالب پر ایک نظر	446
2۔دشمنوں کی طرف اسلام کے خلاف پروپیگنڈا اور کارکردگی	446
3۔مغربی ممالک میں حقوق بشر کا جھوٹا دعویٰ	448
4۔اسلامی نظام پر تشدد طلب ہونے کا الزام اور اس کے خلاف سازشیں	449
5۔لوگوں میں انتخابات سے بائیکاٹ کا راستہ ہموار کرنا	450
6۔اسلامی مقدسات کی توہین کرنے والوں اور ثقافتی سازشوں سے مقابلہ کی ضرورت	451
7۔خداوند عالم کی رحمت اور غضب کے بارے میں اسلامی تصویر کشی	453
8۔ہدایت کے موانع کو برطرف کرنے، دشمنوں اور منافقین سے مقابلہ کی ضرورت	455
9۔اسلامی سزا کے احکام کی مخالفت	458
10۔تشدد، اسلامی سزائی قوانین میں محدود نہیں ہے	459
11۔ہر موقع پر علمی شبہات اور اعتراضات کا جواب دیا جائے (اسلامی نظریہ)	462
12۔دشمن کی سازشوں سے مقابلہ کی ضرورت	463
13۔دشمنان اسلام سے مقابلہ اور اعلان برائت ضروری ہے	464
اڑتیسویں نشست	467
اسلامی قوانین کے ساتھ مغربی نظریات کا ٹکراؤ	467
۱۔تحریک مشروطیت اور مغربی کلچر کا رواج	467
۲۔اسلام میں مطلوب اور مقصود آزادی کے نقشہ پر بعض مؤلفین کی نارضامندی	468
۳۔مفسد فی الارض کے بارے میں اسلامی حکم	469
۴۔سخت رویہ نہ اپنانے کا نتیجہ	471

عنوان	صفحہ نمبر
۵۔تشدد کی بحث کے مقابلہ میں غیر ذمہ دارانہ رویہ	473
۶۔قرآن مجید میں لفظ" تشدد" کے ہم معنی لفظ کی تحقیق	473
۷۔مغربی اور اسلامی نظر میں تحمل اور ٹولرانس کے معنی	474
انتالیسویں نشست	477
دینی عقائد واقدار کے نسبی ہونے کے نظریہ کی تحقیق وبررسی	477
۱۔دینی مسائل کو مطلق یا نسبی قرار دینا	477
2۔معرفت کے نسبی ہونے کے سلسلہ میں تین نظریات	478
الف: معرفت کے نسبی ہونے پر پہلا نظریہ	478
ب۔معرفت کے نسبی ہونے پر دوسرا نظریہ	479
۳۔بعض اقدار کا مطلق اور ثابت ہونا	480
بعض اقدار کے مطلق ہونے کا معیار	482
۴۔مغربی تمدن میں تمام دینی عقائد نسبی ہیں	483
ج۔معرفت کے نسبی ہونے پر تیسرا نظریہ (معرفت دینی میں نسبیت کا وجود)	485
۵۔قرائت نسبی اور قرائت مطلق دونوں جدا جدا ہیں	486
۱۔گذشتہ مطالب پر ایک نظر	488
۲۔واقع نما اور غیر واقع نما زبانوں کی اہمیت	489
۳۔دین کی زبان کو غیر واقع نما قرار دینے کا سبب	490
۴۔مغربی نسبی گرائی نظریہ کی ترویج (وتبلیغ) کرنے والے مغرب پرست روشن خیال	492
۵۔ہابیل اور قابیل کے واقعہ سے انحرافی نتیجہ	493
۶۔دین کی زبان واقع نمانہ ہونا یا دین کی ایک مبہم تصویر	495
۷۔قرآن مجید کا شعراء کی زبان سے مقابلہ کرنا؛ بہت سے نتائج ہونے پر دلیل ہے!!	496
۸۔ہرمنوٹک فلسفہ میں قرائت کی کثرت اور معرفت کا سیلاب	499
۹۔الفاظ کے ذریعہ مختلف حقائق کو سمجھا جا سکتا ہے	500

عنوان	صفحہ نمبر
۱۰۔قرآن کریم سے مطلق اور واقعی معرفت کا حاصل کرنا ممکن ہے	501
۱۱۔قرآن کی زبان کو واقع نما نہ ہونے پر نسبی نظریہ رکھنے والوں کی بے بنیاد دلیل	502
۱۲۔تحریف دین کے سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام کا اظہار افسوس	504
۱۳۔دینی سلسلہ میں ذاتی سلیقہ کو رد کیا جائے	507
چالیسویں نشست	508
دینی معارف افسانہ ہیں یا حقیقت نما آئینہ	508
۱۔گذشتہ مطالب پر ایک نظر	508
۲۔واقع نما اور غیر واقع نما زبانوں کی اہمیت	508
۳۔دین کی زبان کو غیر واقع نما قرار دینے کا سبب	510
۴۔مغربی نسبی گرائی نظریہ کی ترویج (وتبلیغ) کرنے والے مغرب پرست روشن خیال	512
۵۔ہابیل اور قابیل کے واقعہ سے انحرافی نتیجہ	513
۶۔دین کی زبان واقع نما نہ ہونا یا دین کی ایک مبہم تصویر	515
۷۔قرآن مجید کا شعراء کی زبان سے مقابلہ کرنا؛ بہت سے نتائج ہونے پر دلیل ہے!!	516
۸۔ہرمنوٹک فلسفہ میں قرائت کی کثرت اور معرفت کا سیلاب	519
۹۔الفاظ کے ذریعہ مختلف حقائق کو سمجھا جا سکتا ہے	520
۱۰۔قرآن کریم سے مطلق اور واقعی معرفت کا حاصل کرنا ممکن ہے	521
۱۱۔قرآن کی زبان کو واقع نما نہ ہونے پر نسبی نظریہ رکھنے والوں کی بے بنیاد دلیل	522
۱۲۔تحریف دین کے سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام کا اظہار افسوس	524
۱۳۔دینی سلسلہ میں ذاتی سلیقہ کو رد کیا جائے	527

مختصر تعارف

حضرت آیت اللہ محمد تقی مصباح یزدی

محمد مصباح یزدی ۱۳۱۳ھ ش میں شہر یزد میں پیدا ہوئے۔ آپ نے حوزہ کی ابتدائی اور مقدماتی تعلیم کو یزد میں ہی مکمل کیا۔ اور تعلیم کو مرحلہ تکمیل تک پہچانے کی غرض سے نجف اشرف کا سفر کیا۔ لیکن مالی مشکلات کی بنا پر نجف چھوڑ کر قم چلے آئے۔

۱۳۳۱ھ ش سے لے کر ۱۳۳۹ھ ش تک امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کے درسوں میں شرکت کرتے رہے اور اسی دوران تفسیر قرآن، شفا اور اسفار کے دروس کو علامہ طباطبائی کے پاس مکمل کیا۔ اور تقریبا ۱۵ سال تک آیت اللہ بہجت کے درس میں حاضر ہوتے رہے۔ اس کے بعد امام کے ملک بدر ہونے کی وجہ سے امام کے دروس کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس دوران موصوف نے مختلف موضوعات منجملہ جہاد، قضا اور حکومت اسلامی جیسے موضوعات پر تحقیق کرنا شروع کیا۔

آپ پہلوی حکومت کے ساتھ معرکہ آرائی میں بھی حصہ دار تھے ڈاکٹر شہید بہشتی، شہید باہنر اور آیت اللہ رفسنجانی کے ساتھ ہمکاری کرتے تھے اور اس دوران دو مجلّات بنام ''بعثت'' اور ''انتقام'' میں بھی اہم کردار نبھاتے تھے مخصوصا مجلہ انتقام سے متعلق تمام امور آپ کے ذمہ تھے۔

اس کے بعد مدرسہ حقانی میں آیت اللہ جنتی، شہید بہشتی اور شہید قدوسی کے ساتھ اداری کاموں اور تدریس میں مشغول ہو گئے اور تقریباً دس سال تک اس مدرسہ میں فلسفہ اور علوم قرآن کی تدریس کی۔

اس کے بعد انقلاب کی کامیابی سے پہلے اور بعد میں امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کی تائید سے کئی مدارس، کمپلکس اور یونیوسٹیاں قائم کیں کہ جن میں اہم ترین ''موسسہ در راہ حق''، ''دفتر ہمکاری حوزہ و دانش گاہ'' اور ''بنیاد فرہنگی باقر العلوم'' کا نام لیا جا سکتا ہے۔

اور آپ حال حاضر میں رہبر معظم کی تائید سے مؤسسہ امام خمینیؒ کے ہیڈ آفیسر ہیں۔

آیت اللہ مصباح یزدی ۱۳۶۹ ش میں شہر خوزستان کی طرف سے مجلس خبرگان کے نمائندہ مقرر ہوئے۔ اور اس وقت تہران کی طرف سے آپ مجلس خبرگان کے نمائندہ ہیں۔ اور کئی سال سے آپ عالمی اہلبیتؑ اسمبلی کی اعلی کونسل کے سربراہ اور ہیڈ ہیں۔

آپ نے اسلامی فلاسفی، الٰہیات، اخلاق اور عقائد پر مختلف کتابیں تألیف کی ہیں۔

پہلی نشست

اسلامی سیاست کے سلسلے میں چند اہم سوالات

1۔ مقدمہ

بے شک ہمارے اسلامی نظام اور انقلاب کے ثمرات میں سے ایک نماز جمعہ بھی ہے جس کے امت اسلامی کے لئے بہت سے فوائد ہیں مثلاً جس کا ایک ضمنی فائدہ مومنین کو ضروری چیزوں سے آگاہ کرنا ہے، نماز جمعہ کے خطبوں سے قبل یا نماز جمعہ اور نماز عصر کے درمیان تقاریر کا سلسلہ لوگوں کے لئے بہت مفید ہے، چنانچہ شروع انقلاب سے آج تک مختلف اساتید دانشمندان اور خطباء کے ذریعہ مختلف موضوعات منجملہ اعتقادی، تربیتی، اقتصادی، وغیرہ جیسے عظیم اور مہم مسائل پر نماز جمعہ پڑھنے والوں کے درمیان یہ گفتگو ہوتی رہی ہے اور ریڈیو وغیرہ کے ذریعہ بھی دوسرے لوگوں تک یہ آواز پہنچتی رہی ہے۔

ہم نے بھی "اعتقادی نظام اور ارزش اسلام میں توحید کی اہمیت" کے موضوع پر تقریریں کیں ہیں، جو الحمد للہ چھپ کر قارئین کرام تک پہنچ چکی ہیں، فی الحال بعض احباب اور دوستوں کی فرمایش اور ان کے اصرار پر "اسلام کے سیاسی نظریات" کے عنوان کے تحت چند نشستیں آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور امیدوار ہیں کہ خداوند عالم اس سلسلہ میں ہماری مدد فرمائے، اور جو بھی اس کی مرضی ہو اور امت اسلام کے لئے مفید ہو وہ ہمیں الھام کرے، اور ہماری زبان پر جاری کرے، تا کہ شہید پرور اور حزب اللہی امت تک ہم اس کو پہنچا سکیں، ہماری اس بحث کا عنوان بہت وسیع ہے، اس کے اندر مختلف موضوعات کی بحثیں کی جاسکتی ہیں چاہے وہ عمیق ہوں یا سادی اور رواں۔

اگر چہ اس سلسلہ میں امام خمینی کی تحریک کے آغاز (یعنی 1341 ہجری شمسی) سے لے کر آج تک بہت سی گفتگو ہوتی رہی ہے اور مضامین و کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، اس طرح بہت سی تقاریر بھی ہوتی رہیں ہیں، لیکن معاشرہ کے متوسط فہم لوگوں کے لئے بہت ہی کم اس طرح کے منظم مطالب بیان کئے گئے ہیں، بہر حال احباب کا اصرار تھا کہ ان مطالب کو اس ترتیب سے بیان کیا جائے تا کہ سبھی لوگ اس سے استفادہ کر سکیں، اور مختلف لوگوں کی خصوصا جوان طبقہ کی ضرورت کو پورا کر سکے، الحمد للہ ہماری قوم تمدن کے لحاظ سے بہت عمدہ ہے، خصوصاً آخری چند سالوں میں ہمارے معاشرے اور ماحول نے بہت زیادہ ترقی کی ہے، اور بہت سے دقیق و عمیق مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، بہر حال علمی اور ادبی زبان، علمی مراکز (یونیورسٹی اور حوزات علمیہ) سے مخصوص ہے، اور اگر عوام کے لئے گفتگو کرنا ہوتی ہے تو حتی المقدور علمی اصطلاحات نہیں ہونی چاہئے تا کہ اکثر لوگ (چونکہ مطالعہ نہیں ہے) ان ابحاث سے فائدہ اٹھا سکیں، البتہ اس بات کی توجہ رکھنی چاہئے کہ اسلام کے سیاسی فلسفہ

کے تحت جو گفتگو کی جائے گی اتنی مفصل بحث ہے جس کو 100 نشستوں میں بھی بیان کرنا مشکل کام ہے، اس وجہ سے ہم اپنے وقت اور جلسات کی محدودیت کی بنا پر کچھ منتخب مسائل کو چھیڑیں گے، اور جن مسائل کی زیادہ ضرورہے، اور جن کے سلسلہ میں سوالات اور شبہات کئے جاتے ہیں، ان کے بارے میں بحث کریں گے۔

یہ توجہ رہے کہ ہمارا موضوع بنام "اسلام کا سیاسی فلسفہ" تین کلموں سے مرکب ہے جس کے ہر ایک کلمہ کے لئے مفصل بحث درکار ہے اور سیاسی فلسفہ کی متعدد اصطلاح ہیں (مثلاً علم سیاست کا فلسفہ وعلم سیاست کے مقابل میں فلسفۂ سیاسی) لیکن فلسفہ سیاسی سے ہماری یہاں مراد حکومت وسیاست کے بارے میں اسلامی نظریات کی توضیح وتفسیر ہے جو خاص اصولوں پر قائم ہے، اور اسلامی حکومت کے سیاسی افکار بھی انہیں اصولوں کی بنیاد پر قابل وضاحت ہیں۔

2۔ اسلام اور اس کا سیاسی نظریہ

جس وقت ہم یہ بحث کرتے ہیں کہ اسلام "سیاست اور حکومت" کے سلسلہ میں ایک خاص نظریہ رکھتا ہے، جو اسلامی اصول وضوابط پر بنا رکھے ہوئے ہے تو سب سے پہلے یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا دین سیاست وحکومت کے بارے میں کوئی خاص نظریہ رکھتا ہے تاکہ اسلام اس سیاسی نظریہ کو بیان کرے؟ یہ ایک ایسا مشہور سوال ہے جو صدیوں سے مختلف ممالک اور مختلف معاشرہ میں ہوتا آیا ہے، ہمارے ملک میں بھی یہ سوال مورد بحث چلا آیا ہے خصوصا مشروطیت کے زمانے سے آج تک اس سوال پر کافی زور دیا گیا ہے، اور اس سلسلہ میں مختلف طریقوں سے بحث بھی ہوچکی ہے، البتہ امام خمینیؒ کے بیانات کے پیش نظر اور مرحوم شہید مدرس کے مشہور ومعروف جملہ کہ "ہمارا دین عین سیاست اور ہماری سیاست عین دین ہے" جس نے ہمارے ذہن میں نقش بنالیا ہے، اور یہ مسئلہ ہم لوگوں کے لئے واضح اور روشن ہوچکا ہے، اور ہم اپنے لئے اس سوال کا واضح جواب رکھتے ہیں، لیکن اسلام کے سیاسی نظریہ اور دین کی سیاست میں دخالت جیسے مسائل پر تحقیق اور بررسی کی ضرورت ہے۔

مغربی تمدن میں دین کو جامعیت نہیں دی گئی ہے اور اس کو محدود کرکے پیش کیا گیا ہے کہ دین کا تعلق اجتماعی وسیاسی مسائل سے نہیں ہے، فقط دین کے اندر انسان کا خدا سے رابطہ ہونا چاہئے اور فرد کا رابطہ خدا سے کیا ہے اس اس چیز کو دین کے اندر مغربی تمدن کے نزدیک بیان کیا جاتا ہے، لہٰذا سیاسی، اجتماعی، بین الاقوامی، حکومت اور لوگوں کے درمیان روابط اور حکومتوں کے آپسی روابط یہ سب انسان اور خدا کے رابطہ سے جداگانہ چیزیں ہیں، یعنی ان کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے، لیکن اسلامی نقطہ نگاہ سے دین ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس کے اندر انسان کے فردی مسائل اجتماعی مسائل شامل ہیں اور اس کے اندر انسان کا خدا سے رابطہ اور انسان کا آپس میں رابطہ اور دیگر سیاسی، اجتماعی اور بین الاقوامی روابط بھی شامل ہیں یعنی دین کے اندر یہ ساری باتیں پائی جاتی ہیں، کیونکہ اسلام کے اعتبار سے خداوند عالم تمام دنیا پر حاکم ہے لہٰذا سیاست، اقتصاد (معاش) تعلیم وتربیت، مدیریت اور وہ تمام مسائل جو انسانی زندگی سے متعلق ہیں وہ سب دینی احکام میں شامل ہیں۔

3۔ اسلامی سیاسی نظریہ کا بنیادی ہونا

اب جبکہ ہم نے قبول کرلیا کہ اسلام حکومت اور سیاست کے سلسلے میں اپنا ایک نظریہ رکھتا ہے، اور حکومت و سیاست کے بارے میں اسلام کی طرف ایک خاص نظریہ کی نسبت دی جاسکتی ہے، اس نظریہ کی ماہیت و کیفیت کے بارے میں چند سوال پیدا ہوتے ہیں۔

کیا اسلام کا سیاسی نظریہ ایک بنیادی نظریہ ہے یا کسی نظریہ کی تقلید ہے؟ یعنی کیا اسلام نے یہ نظریہ اختراع اور ایجاد کیا ہے اور خدا کے نازل شدہ تمام احکام تعبدی کی طرح اس نظریہ کو پیش کیا ہے یا یہ کہ اسلام نے کسی ایک نظریہ کو لے کر اس کی تائید کر کے پیش کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ اسلام نے بہت سے مسائل میں سیرت عقلاء کی تائید کی ہے، جسے اصطلاحاً اسلام میں "امضاء روش عقلاء" کہا جاتا ہے، مثال کے طور پر عام انسان جس طرح کے معاملات کرتے ہیں مثلاً خرید و فروخت، کرایہ، بیمہ وغیرہ ان کو سیرت عقلائی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کہ لوگوں نے ان کو ایجاد کیا ہے اور شارع مقدس نے ان کی تائید فرمائی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حکومت اور سیاست کے سلسلہ میں اسلام کا نظریہ اسی طرح ہے کہ عقلاء نے کچھ حکومت و سیاست کے بارے میں نظریہ قائم کیئے اور ان کو قبول کیا، اور شارع مقدس نے بھی ان نظریات کی تائید کرنے کے بعد قبول کرلیا ہے؟ یا یہ کہ خود اسلام نے اس سلسلے میں اپنا ایک خاص اور اختراعی نظریہ پیش کیا ہے؟ اور دنیا کے تمام نظریات کے مقابلے میں اسلامی حکومت کے بارے میں پیش کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے حکومت اور سیاست کے بارے میں سیاسی و اجتماعی زندگی کے لئے بنیادی و اختراعی اصولوں پر مشتمل ایک مجموعہ پیش کیا ہے، نہ یہ کہ اسلام کے نظریات تقلیدی اور تائیدی ہیں جو حضرات حکومت کے مختلف اشکالات اور سیاسی فلسفہ سے آگاہی رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس سلسلے میں مختلف نظریات موجود ہیں جن میں سے ایک نظریہ "تئوکراسی" (الٰہی حکومت) بھی ہے یہ نظریہ عیسوی صدی کے وسط میں یعنی تقریباً ایک ہزار سال پہلے یورپ میں کلیسا (عیسائی کی عبادتگاہ) کی طرف سے پیش کیا گیا مخصوصاً کیتھولک عیسائیوں کے کلیسا کا کہنا یہ تھا کہ ہم لوگ خدا کی طرف سے لوگوں پر حاکم ہیں، اس کے مقابلہ میں عیسائیوں کا دوسرا فرقہ یہ کہتا ہے تھا کہ حضرت عیسیٰ مسیح کا دین سیاست سے جدا ہے، یعنی دین اور سیاست میں کوئی ربط نہیں ہے۔

بہر حال دوسرے فرقے کا اعتقاد یہ تھا کہ پاپ کو حکومت کا حق ہے، اور خدا کی طرف سے کلیسا کو ایسا صاحب اقتدار ہونا چاہئے جو لوگوں پر خدا کی طرف سے حکومت کر سکے، اور لوگوں کو بھی خدا کے حکم سے پاپ کی اطاعت کرنا چاہئے اس نظریہ کو تئولوکراسی حکومت نام دیا گیا۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام عام لوگوں کی ایجاد شدہ حکومت کے علاوہ اپنے خاص نظریہ کے تحت اسلامی اور الٰہی

حکومت کو پیش کرتا ہے تو کیا اس سے یہی تئوکراسی حکومت مراد ہوتی ہے جسے مغرب اور یورپ میں سمجھا جاتا ہے اور الٰہی حکومت ان کے تمدن میں اسی معنی میں پہچانی جاتی ہے؟ اور جس طرح تئوکراسی حکومت میں خداوند عالم نے حاکم کو وسیع پیمانے پر اختیارات دیئے ہیں اور وہ اپنی مرضی کے مطابق لوگوں پر حکومت کرسکتا ہے اور لوگوں پر بھی واجب ہے کہ اس حاکم کی مرضی کے مطابق عمل کریں؟ کیا حکومت الٰہی وولایی کے مطابق بھی جس کا ہم دعوی کرتے ہیں اور اسلام کے ولایت فقیہ کے نظریہ کے تحت کیا ولی فقیہ اپنی مرضی کے مطابق لوگوں پر حکومت کا حق رکھتا ہے اور کیا اس کو یہ بھی حق ہے کہ جس طرح وہ چاہے قوانین بنا کر ان کے ذریعہ لوگوں پر حکومت کرے، اور لوگوں پر بھی اس کی اطاعت واجب ہے؟

یہ سوال بہت اہم ہے اور ضروری ہے کہ اس سلسلے میں ایک مناسب بحث اور تحلیل کی ضرورت ہے تا کہ اس سلسلہ میں جو غلط فہمی پائی جاتی ہے وہ دور ہو جائے۔

مذکورہ سوال کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ جس الٰہی حکومت کے ہم معتقد ہیں اور وہ تئوکراسی حکومت (جو مغرب اور یورپ میں معروف ہے) زمین تا آسمان فرق رکھتی ہے، یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ الٰہی حکومت اسلام کی نظر میں وہی حکومت ہے کہ جس کے عیسائی خصوصاً فرقہ کیتھولک خدا اور پاپ بارے میں قائل ہیں۔

سیاسی صاحب نظر افراد نے حکومت کے نظریات کی کثرت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(1) ڈکٹیٹری حکومت (شہنشاہی حکومت)

(2) ڈیموکراٹک (جمہوری حکومت) اگر چہ ان دونوں کی بہت سی قسمیں موجود ہیں لیکن کلی طور پر حکومت کی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم ایسی حکومت جس میں حاکم اپنی مرضی سے حکومت کرتا ہے اور خود فرمان جاری کرتا ہے اور مختلف طریقوں سے اپنی حکومت کو چلاتا ہے اور اپنی فوجی طاقت کے ذریعہ لوگوں کو اپنی اطاعت پر مجبور کرتا ہے۔

دوسری قسم ایسی حکومت جس میں لوگوں کی رائے دخالت رکھتی ہے اور لوگ اپنی مرضی سے اپنے حاکم کو چنتے ہیں اور حاکم بھی لوگوں کی خواہشات کے مطابق عمل کرنے کے پابند ہوتے ہیں یعنی ان کی حکومت لوگوں کے ارادے اور ان کی چاہت پر موقوف ہوتی ہے۔

4۔ اسلامی حکومت کی حقیقت اور اس کے ارکان

جن لوگوں نے حکومت کے سلسلہ میں مغربی تقسیم کو قبول کیا ہے اور معتقد ہیں کہ حکومت دو حال سے خالی نہیں ہے حکومت یا ڈکٹیٹری ہے یا ڈیموکراٹک اور جمہوریت، اب یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت ڈکٹیٹری حکومت ہے یعنی جو بھی حکومت پر ہو مختار ہے مثلاً ہمارے زمانہ میں ولی فقیہ اپنی طاقت وقدرت اور اسلحہ کے ذریعہ لوگوں پر حکومت کرتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتا ہے یا اسلامی حکومت کا کوئی نیا انداز ھے؟ یا اسلامی حکومت کی کوئی تیسری شکل ہے کہ نہ ڈکٹیٹری

ہے اور نہ جمہوریت؟

بہر حال حکومت کی دوگانہ تقسیم ایسی ہیں جن کو تمام لوگوں نے قبول کیا ہے لہٰذا اسلامی حکومت مذکورہ تقسیم سے خارج نہیں ہے یا یہ حکومت ڈکٹیٹری ہے یا جمہوری اگر اسلامی حکومت جمہوری ہے تو اسلامی حکومت کو یورپی حکومت میں پائے جانے والے طور طریقے اپنانا چاہئیں، اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اسلامی حکومت ڈکٹیٹری حکومت ہوگی جو صرف خاص فرد کی مرضی پر تکیہ زن ہوتی ہے اور اس سلسلہ میں تیسرے نظریہ کو انتخاب کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لہٰذا ضرورت ہے اس چیز کی کہ اس اہم سوال کا جواب دیں اور بیان کریں کہ اسلامی حکومت ڈکٹیٹری ہے یا جمہوری یا کوئی تیسری قسم انہیں سوالوں میں سے ایک سوال یہ بھی ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے مقدمات اور اس کے ارکان کیا ہیں؟ وہ کون سے ارکان ہیں کہ جن پر حکومت اسلامی کو توجہ رکھنی چاہئے تا کہ واقعی طور پر حکومت اسلامی ہو سکے؟ جو حضرات ہمارے مذہب اور فقہ کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ اگر نماز کے ارکان میں کوئی ایک بھی رکن چھوٹ جائے چاہے عمداً طور پر چھوڑا جائے یا سہواً چھوٹ جائے اس کی نماز باطل ہو جائیگی درحقیقت ارکان نماز سے ہی نماز ہے اسی طرح اسلامی حکومت کے ارکان ہونا چاہئے کہ اگر وہ ارکان موجود ہوں تو اس حکومت کو اسلامی حکومت کہا جائے گا اور اگر وہ ارکان نہیں ہیں یا اگر ان میں خلل (کمی وزیادتی) پائی جائے تو اس کو حکومت اسلامی نہیں کہا جائے گا۔

انہیں ارکان کی اہمیت کے پیش نظر جن پر اسلامی حکومت موقوف ہوتی ہے، ہم ان ارکان سے آگاہ ہونے کی خاطر ان کے بارے میں گفتگو کرنا ضروری سمجھتے ہیں، کیونکہ جب ہم ان ارکان کو پہچان لیں گے تو اسلامی حکومت کا معیار و ملاک ہمارے ہاتھ میں آجائے گا کہ جس کے ذریعہ سے ہم اسلامی اور غیر اسلامی حکومت کے فرق کو مکمل طریقہ سے پہچان لیں گے اسی وجہ سے اس اہم سوال کا جواب بہت ضروری ہے۔

5۔ اسلامی حکومت کا ڈھانچہ، اس کے اختیارات اور وظایف کی وسعت

اس سلسلہ کا ایک دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اسلام نے حکومتِ اسلامی کی ایک خاص شکل وصورت معین کی ہے؟ جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ آج کی اس دنیا میں حکومت کے کیا ڈھانچے اور طور طریقے ہیں اور قدیم زمانے میں بھی حکومت کی شکل وصورت ہوتی تھی جو اس وقت نہیں ہے۔

موجودہ حکومتوں کی بعض قسمیں اس طرح ہیں:

1۔ بادشاہی حکومت، مشروطہ و مطلق۔

2۔ جمہوری حکومت (ریاستی یا پارلیمینٹ کی حکومت)۔

3۔ الٰہی حکومت۔

کیا اسلام نے حکومت کی ان شکلوں میں سے کسی ایک کو قبول کیا ہے یا اسلام نے خود ایک خاص شکل معین کی ہے جو

مذکورہ شکلوں سے فرق رکھتی ہے یا یہ کہ اسلام نے حکومت کے لئے کوئی خاص طریقہ کو نہیں اپنایا، اور فقط حکومت کے لئے چند معیار معین کئے ہیں جن کا ہر طرح کی حکومت میں لحاظ کرنا ضروری ہے؟ مثال کے طور پر اسلام کا حکم ہے کہ حکومت میں عدالت کا لحاظ رکھا جائے لیکن عدالت کا کس طرح لحاظ رکھا جائے؟ کیا عدالت زمان ومکان کے اعتبار سے لحاظ کی جائے؟ چنانچہ دنیا کے کسی بھی گوشہ میں کسی بھی وقت زمان ومکان کے اعتبار سے اس طرح کی عدالت لحاظ کیا جاسکتا اور اسلام نے ایک خاص شکل وصورت کی عدالت برتنے پر اصرار نہیں کیا ہے؟! اور اسلام کی نظر میں حکومت کی مناسب شکل اس کے معیار کی رعایت پر ہے۔

اور اگر اسلام نے حکومت کے لئے کسی خاص شکل وصورت کا انتخاب کیا ہے تو کیا اسلام کی نظر میں اس حکومت کا ڈھانچہ ایک ثابت اور پائیدار ڈھانچہ ہے؟ یا یہ کہ اس کا ڈھانچہ غیر پائیدار ہے کہ جس میں اکثر وبیشتر تبدیلی وتغیر ہوسکتی ہے؟

اس طرح کے سوالات اسلامی حکومت کے ڈھانچے اور شکل وصورت کے بازے میں ہوتے رہتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ان کے جوابات بھی دیئے جائیں۔ فلسفہ حکومت کے سلسلے میں ایک دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ اسلامی حاکم اور رئیس چاہے وہ کوئی ایک فرد ہو یا ایک گروہ یا ایک مجلس وانجمن کی شکل میں ہو، یعنی اسلامی حکومت کے اختیارات کیا کیا ہیں؟ اور اسی طرح حکومت کی ذمہ داریاں کیا کیا ہیں؟ کیونکہ گذشتہ زمانے اور عصر حاضر کی حکومتوں میں ذمہ داریوں کے لحاظ سے کافی فرق نظر آتا ہے بعض حکومتیں اختیارات اور وظایف کے لحاظ سے کافی محدود ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ بعض حکومتیں فقط لوگوں کی عام حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہیں جو اہم ہوتے ہیں، اور اکثر کاموں میں خود لوگوں کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے لیکن بعض حکومتوں کے اختیارات بہت وسیع ہوتے ہیں جس کے نتیجہ میں اس کے وظایف اور ذمہ داریاں بھی وسیع ہوتی ہیں اس حکومت کی ذمہ داریاں بہت مہم اور خطرناک ہوتی ہیں کہ جن کے بارے میں اسے جواب دہ ہونا ہوتا ہے اور ان ذمہ داریوں کو تمام لوگوں پر نہیں چھوڑا جاسکتا کیونکہ لوگوں کو حق ہے کہ وہ حکومت سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے سلسلے میں مطالبہ کریں۔

اسی طرح یہ بھی روشن ہونا چاہئے کہ اسلام کے سیاسی فلسفہ کے تحت اسلامی حکومت نے کیا کیا اختیارات وذمہ داریاں معین کی ہیں اور بلاشبہ یہ اختیارات وذمہ داریاں مناسب اور متعادل ہونی چاہئیں، جن مقدمات پر کوئی کام موقوف ہو ان مقدمات کو فراہم نہ کرکے کسی کے سپرد کوئی ذمہ داری کی جائے تو یہ صحیح نہیں ہے۔

بہرحال اسلامی حکومت کے اختیارات اور اس کی ذمہ داریاں کیا کیا ہیں؟ اس اہم سوال کے بارے میں ہم گفتگو کریں گے۔

6۔ اسلامی حکومت میں لوگوں کا کردار اور چند دیگر سوالات

آج کے انہیں اہم سوالوں میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ حکومت اسلامی میں لوگوں کا کردار کیا ہے؟ لوگوں کے اختیارات اور ان کی ذمہ داریاں کیا کیا ہیں؟ انہیں سوالوں میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ صدر اسلام میں حضرت رسول خدا،

حضرت علی علیہ السلام اور حضرت امام حسن علیہ السلام کی حکومتوں کی کیا شکل تھیں؟ اسی طرح بنی امیہ و بنی عباس وغیرہ کی حکومتیں کس حد تک اسلامی تھیں؟

اور جس وقت ہم اسلامی حکومت کی گفتگو کرتے ہیں تو اس سے مراد مذکورہ حکومتوں سے کون سی حکومت مراد ہوتی ہے؟ اور تاریخ میں اسلامی حکومت کی تشکیل کس طرح ہوتی آئی ہے کہ نتیجۃً اسلامی حکومت کی یہ شکل اسلامی انقلاب کے ذریعہ ایران میں بھی وجود میں آئی؟

البتہ مذکورہ سوالات کے ضمن میں دوسرے جزئی سوال بھی ہوتے ہیں منجملہ یہ سوال کہ کیا ہماری یہ حکومت سو فی صد اسلامی حکومت ہے؟ اور کیا اس میں اسلامی حکومت کے تمام معیار وضوابط موجود ہیں؟ اور اگر اس میں وہ تمام معیار وضوابط موجود ہیں تو کیا اس حکومت نے ان کی رعایت کی ہے؟ اسی طرح یہ سوال کہ اس حکومت میں کیا کیا نقص ہیں؟

7۔ اسلام کے سیاسی نظریہ کو پہچاننے کے طریقے

قبل اس کے کہ ہم مذکورہ سوالات اور شبہات کا جواب دیں اور فلسفہ سیاسی اسلام میں وارد ہوں اس چیز کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اس روش وطریقے کو پہلے بیان کردیں جس کو مذکورہ بحث کی تحقیق اور بررسی میں اپنائیں گے اس بحث کی متدلوژی (طور وطریقہ) کیا ہے، بہرحال یہ ایک مقدماتی بحث ہے کہ جس کو شروع میں بیان کردینا چاہئے، کیا یہ ہماری بحث کا طریقہ اور عقلی روش ہے؟ یعنی کیا ہم عقلی دلیلوں کے ذریعہ اسلام کے نظریات کو بیان کریں گے؟ یا ہماری روش اور شیوہ بحث تعبدی اور نقلی ہوگا یعنی قرآن وسنت کے تابع ہے؟ گویا اس حکومت کے اصول وضوابط قرآن وروایات سے اخذ کیئے جائیں گے؟

یا یہ کہ اسلامی سیاست ایک تجربہ کی طرح ہے؟ کہ جس کے درست اور غیر درست ہونے کو تجربہ ہی ثابت کرسکتا ہے؟ اس صورت میں ہماری گفتگو کا شیوہ تجربہ ہوگا اور فیصلہ کرنے کا معیار بھی تجربہ ہوگا۔

بہرحال چونکہ ہماری بحث عقلانی پہلو رکھتی ہے اسی وجہ سے اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ عقلی بحث کی کم از کم دو قسمیں ہیں:

(1) جَدَلی طریقہ۔ (2) برہانی اور دلائل کا طریقہ۔

جس وقت ہم کسی گفتگو کو شروع کرتے ہیں اور عقلی لحاظ سے کسی ایک موضوع کی تحقیق کرتے ہیں تو کبھی ایسے اصول ومقدمات سے بحث کرکے مجہول نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ جن مقدمات اور اصول کو ہم اور ہمارا مخالف قبول کرتا ہے اس کے مقابلہ میں وہ برہانی راہ وروش ہے کہ جس میں تمام مقدمات بھی مورد بحث قرار پاتے ہیں گویا بحث خود قضایا اولیہ ویقینیات وبدیہیات سے ہوتی ہے تاکہ ان کے ذریعہ ہمارا استدلال اور برہان یقینی اور قطعی قرار پائے، اور ظاہر ہے اگر ہم اس راستہ کو اختیار کریں تو بحث طولانی ہوجائے گی۔

مثال کے طور پر اگر ہم برہان کے ذریعہ ثابت کرنا چاہیں کہ حکومت اسلامی میں عدل وانصاف رعایت ہونا چاہئے تو سب سے پہلے ہمیں عدل کے مفہوم اور معنی کو واضح کرنا ہوگا اور اس کے بعد اس سوال کا جواب دیں کہ عدالت کا کس طرح لحاظ رکھا جائے؟ اسی طرح یہ سوال کہ عدالت اور آزادی ایک جگہ جمع ہوسکتی ہیں یا نہیں نیز اسی طرح یہ سوال کہ عدالت کے معیار کو کون معین کرے؟ کیا عدالت کے معیار کو خداوند عالم معین کرے یا عقل؟

مذکورہ سوالات کے حل ہونے کے بعد یہ سوال ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں عقل کس حد تک فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے؟ کیا عقل کی قضاوت ایک خاص مقدار میں ہے یا مطلق طور پر اس طرح یہ بحث طول پکڑ جاتی ہے یہاں تک کہ اصول اولیہ اور مسائل معرفت شناسی کے بارے میں مورد سوال قرار پاتے ہیں بہرحال ان کو بھی واضح وروشن ہونا چاہئے، خلاصہ یہ عقل کیا ہے؟ اور اس کی دلالت کس طرح کی ہے؟ عقل کس طرح استدلال کرتی ہے؟ اور عقل کا اعتبار اور اس کا حکم کس حد تک قابل قبول ہے؟ اور ظاہر ہے کہ اگر ہم اس طرح کے مسائل پر تحقیق کریں تو مختلف علوم سے بحث کرنی پڑے گی، جو ایک طولانی مدت چاہتی ہے جو مفقود ہے۔

بہرحال برہانی بحث کرنا اپنی جگہ مقدس اور محترم ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بھی اشارہ کیا کہ برہانی و استدلالی بحث کرنے کے لئے بہت سے علوم کا سہارا لینا پڑتا ہے اور بہت کم افراد ہی ان علوم میں مہارت رکھتے ہیں اور علم کے ماہر انسان اس کے محدود مسائل تک ہی رسائی رکھتے ہیں خلاصہ یہ کہ یہ کام کافی مشکل ہے اور اس طرح کے مسائل کو واقعاً حل کرنے ایک طویل مدت درکار ہے ہم بھی اپنی گفتگو میں اگر اسی برہانی راستہ کو اپنائیں اور الگ الگ مسائل سے بحث کر کے بدیہی اصول اور مبنیٰ تک پہنچیں تو ہمارے پاس وقت بہت کم ہے، لہٰذا اپنی بحث کو منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتے، اسی وجہ سے جہاں برہانی بحث سادہ اور غیر پیچیدہ ہے وہاں برہانی اور استدلالی بحث کریں گے اور اس کے علاوہ تمام موارد میں جدلی بحث کریں گے کیونکہ جدلی بحث کا مناسب ترین طریقہ ہے۔

درحقیقت یہ ہدف اور نتیجہ تک پہنچنے کے لئے یہ راستہ درمیانی راستہ ہے، یعنی یہ راستہ دوسروں کو قانع کرنے کے لئے عام راستہ ہے، خداوند عالم نے قرآن مجید میں بارہا دشمن کو قانع کرنے کے لئے اور اپنی طرف سے اتمام حجت کے لئے اس کو بیان کیا ہے، اور ہمیں بھی حکم دیا ہے کہ ہم بھی اس راستہ کو اپنائیں اور دوسروں سے اسی کے ذریعہ بحث اور گفتگو کریں، ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

اُدْعُ إِلىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ اَحْسَن...[1]

"حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعہ اپنے پروردگار کی طرف دعوت دو، اور ان کے ساتھ اچھے طریقہ سے بحث وجدل کرو۔"

---

[1] سورۂ نحل آیت 125

دوسری نشست

اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کی اہمیت اور ضرورت

ہم نے پہلے جلسہ میں اسلام کے سیاسی نظریہ کے تحت اس سلسلے کے منتخب مسائل کو بیان کیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ اس سلسلے میں ہم کیا کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں، آج ہم خداوند عالم کی مدد سے اس سلسلے میں بحث کریں گے کہ اسلام کے سیاسی نظریہ کی بحث کتنی مہم اور ضروری ہے۔

1۔ اسلامی انقلاب سے مغرب و مشرق کا برتاؤ

اس بحث کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرنے کے لئے ایک نگاہ اپنے ملک اور اس زمانے کے اسلامی ممالک کی تاریخ پر نظر ڈالیں، اور جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں کہ دنیا پرست، قدرت طلب، زور گو افراد ہمیشہ تاریخ میں فتنہ وفساد کے باعث بنے ہیں اور جس طرح انسان کی زندگی ماڈرن ہوتی جارہی ہے اور حکومتیں قاعدہ وقانوں اور علم کی بنیاد پر ترقی کی طرف گامزن ہیں، فتنہ وفساد کی فعالیت بھی عملی تر اور قواعد وضوابط کے بنیاد پر دقیق تر ہوتی جارہی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کی طاقتیں اس نتیجہ پر پہنچ گئی ہیں کہ دنیا کی دو بڑی سُوپر طاقت یعنی مغرب کی ثروتمند طاقت اور مشرق کی مارکسست اور کمیونیسٹ طاقت موجود ہیں اور جنگ کی کامیابی کے بعد دونوں طاقتوں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اپنی قدرت سے دوسرے ممالک کو بھی خوف زدہ کیا جائے تا کہ وہ ان کے مقابلہ میں سر نہ اٹھا سکیں۔

اور جب بھی کسی نے ان فتنہ گر اور مفسدوں کے مقابلہ میں سر اٹھایا ہے اسکو نیست ونابود کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان ظالم وستم گروں کا مقابلہ کرنے والے انبیاء اور ان کے پیروکار تھے جو کسی بھی زمانہ میں ستم گروں وظالموں کے مقابلہ میں تسلیم نہیں ہوئے اسی وجہ سے ظالم وستمگروں نے انبیاء اور ان کے پیروکاروں کو اپنا دشمن سمجھا اور ان کے ساتھ دشمن جیسا سلوک کیا، لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد، خصوصاً کلیسا کو جو یورپ میں دینی قدرت کا مظہر تھا میدان سے خارج کرنے بعد یہ گمان کر بیٹھے کہ اس وقت دنیا میں کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو ان کے مقابلہ میں آسکے۔

لیکن بیسویں صدی کی آخری تین دھائیوں میں غیر یقینی طور پر ایران کے انقلاب کو دیکھتے ہوئے بہت تعجب ہوا، شروع میں تو یہ سوچا کہ کہ ایران کا یہ انقلاب ان دوسری انقلابی تحریکوں کی طرح ہے جو کبھی کبھی اسلامی ممالک میں ہوتی چلی آئی تھیں کہ جن کو کلّی طور پر نیست ونابود کر دیا گیا تھا، انہوں نے یہ سوچ لیا تھا کہ ہم اپنے مخصوص تجربات کے ذریعہ اس انقلاب کو

بھی جڑ سے اکھاڑ پھینک دیں گے، لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا انہوں نے دیکھا کہ یہ انقلاب تو دوسری تحریکوں سے بہت نمایاں فرق رکھتا ہے۔

بہرحال اسلامی انقلابِ ایران کے نتیجہ میں اس منطقہ میں ایک بڑی طاقت رونما ہوئی، انقلاب اسلامی نے مشرق ومغرب پر بھروسہ نہ کیا اور نہ ہی بغاوت جیسی تحریکوں اور فوجی ٹکراؤ کا سہارا لیا، بلکہ غرب کو ناکام کرتے ہوئے اسلامی حکومت تشکیل دیدی۔

اسلام دشمن طاقتوں کے پاس دینداری سے مقابلہ کا جو کچھ تجربہ تھا وہ سب انقلاب اسلامی کے نابودی کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کیا مگر کامیاب نہ ہوسکے، آپ حضرات کے لئے تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہم فقط اشارہ کرتے ہوئے گذرتے ہیں۔

شروع انقلاب میں ملکی حالات کو خراب کرنے کی کوشش کی، اس امید میں کہ یہاں پر ایسی ایک حکومت تشکیل دی جائے جو مغرب کے لئے کام کرے، لیکن انہوں نے دیکھا کہ لوگوں کی طاقت وقدرت اس سے کہیں زیادہ ہے کہ یہ گروہوں کو تحریک کرکے انقلاب اسلامی کے لئے کوئی خطرہ ایجاد کریں یہاں تک کہ اپنے مختلف حربے استعمال کیئے منجملہ یہ کہ ایران پر اقصادی پابندی لگائی عراق کے ذریعہ آٹھ سال تک جنگ تھوپی ان تمام حربوں کے ذریعہ انقلاب اسلامی کو ناکام کرنا چاہتے تھے لیکن خدا کے فضل سے کسی طرح بھی کامیاب نہ ہوسکے۔

2۔ جوانوں کی گمراہی کے لئے مغرب کا ایک ثقافتی حربہ

چونکہ دشمن کسی بھی میدان میں کامیاب نہ ہوسکا تو اس کی امید صرف جوانوں پر آکر رکی کہ ایران کے جوانوں کے لئے فرہنگ (کلچر) کے لحاظ سے ایک طولانی مدت پروگرام بنایا جائے، اور اس پروگرام کے تحت مختلف طریقوں سے ملک میں نفوذ کرنا چاہا (کیونکہ اس سلسلے میں ان کے پاس کافی تجربہ موجود تھا) ان کی کوشش یہ تھی کہ ایک ایسا مرکز بتایا جائے کہ جس کے ذریعہ اپنے افکار ونظریات کو نشر واشاعت کی جائے اور اس مرکز کے ذریعہ ملت کے مختلف لوگوں تک اپنی تبلیغاتی لھریں پہنچائی جائیں تاکہ آہستہ آہستہ اپنی مرضی کے مطابق ماحول بنایا جائے، ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں بھی دوسرے پروگراموں کی طرح انہوں نے اپنے علمی حساب وکتاب کے تحت پروگرام بنایا۔

چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ انقلاب کی نسل بڑھاپے کی طرف بڑھ رہی ہے، اور مستقبل کی نبضوں کو جوانوں کے ہاتھوں میں دیکھا (وہ جوان کہ جو شاہ کے ظلم وستم سے آگاہ نہیں ہیں اور نہ ہی انقلاب سے پہلے والے اور انقلاب کے بعد والے اسلامی رزمندوں کی جانثاروں سے آگاہ ہیں، اور صرف وہ اپنی خواہشوں کے پیروں ہیں ان کی مرادیں کبھی مادیات ہوتی ہیں اور کبھی خواہشات) تو یہ کہ جوان طبقہ جو اس وقت ملت کی اکثریت ہے اس میں کسی طرح سے رسوخ پیدا کیا جائے اور آہستہ آہستہ اپنی مرضی کے مطابق ایسی حکومت بنوائیں جو ان کے نفع کیلئے کام کرے، اور وہ اسی کشمکش میں تھے کہ

پروگرام کو کہاں سے شروع کیا جائے، اور اس جوان نسل کے افکار و عقائد میں کس طرح نفوذ کیا جائے، تا کہ ان کی امیدوں کیلئے زمینہ فراہم ہو سکے، چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں بہت اسٹیڈی کی کہ آخر اس قدر لوگ کیوں حکومت اسلامی کے حامی اور وفادار ہیں یہاں تک کہ تمام مشکلات مالی، مہنگائی، بمباری اور دوسری پریشانیوں کو بھی برداشت کر رہے ہیں پھر بھی حکومت اسلامی کی حمایت سے باز نہیں آتے، ان تمام چیزوں کو دیکھ کر دشمن اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ سب اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ دین اسلام کے معتقد ہیں۔

3۔ فرہنگی تین حربے

کیونکہ ایرانی قوم اہل بیت علیہم السلام کے پیروں ہیں اور ائمہ علیہم السلام اور امام حسین علیہ السلام کو اپنے لئے نمونہ عمل بنایا ہے، اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اسلام کے لئے اپنی جان و مال بھی قربان کر سکتے ہیں اور ان کو یہ اعتقاد ان کی ماں نے دودھ میں پلایا ہے، اور جب تک زندہ رہیں گے، یہ عقیدہ ان کہ دلوں میں باقی رہے گا مگر دشمن اس عقیدہ کو کم رنگ کرنا چاہتا ہے، اور دشمن کی تمنا یہ ہے کہ آئندہ آنے والی نسل میں اس طرح کا عقیدہ باقی نہ رہے اور اس طرح اسلامی حکومت اور اسکے ذمہ دار افراد سے بدظن کر دیں، کیونکہ لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ دین اسلام ہمارا حاکم ہے، اور حکومت کے حقدار علماء اور دیندار افراد ہیں جن کی سرپرست ولی فقیہ، ہے، اور جب تک یہ عقیدہ جوانوں کے درمیان موجود ہے اس حکومت اسلامی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

چنانچہ دشمن نے سوچا کہ اس اعتقاد کو ختم کرنا چاہئے لیکن کس طرح؟ ظاہر ہے کہ یہ افکار روشن فکر طبقہ کے ذریعہ ہی ان تک پہنچائے جا سکتے ہیں، لہٰذا یونیورسٹی اور ثقافتی مراکز کے درمیان ایک ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے ذریعہ یہ افکار ملت تک پہنچائے جائیں، اور ایسے افراد کو بروئے کار لایا جائے جو ان کے افکار کو پھیلائے اور حداقل لوگوں کے دلوں میں خصوصاً جوان طبقہ میں شک و وسوسہ پیدا کریں اور اسلامی حکومت، ولایت فقیہ کی نسبت ان کے عقائد کو ڈاماڈول اور کم رنگ کیا جائے، جوانوں میں حکومتِ اسلامی کی نسبت عقیدہ کو کم رنگ کرنا ہی ان کا مطلوب ہے کیونکہ اگر ان کے دلوں میں شک پیدا ہو گیا تو پھر کوئی دوسرا 13 / سالہ نوجوان کمر سے بم باندہ کر ٹینک کے نیچے نہیں جائے گا، یہ کام تو اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب آخرت اور حساب و کتاب پر ایمان ہو اور اپنے صحیح راستہ کو جانتا ہو، لیکن اگر شک پیدا ہو جائے تو کافی ہے ایک قدم آگے بڑھائے اور پھر پیچھے ھٹ جائے اور یہ شک و تردید دشمن کے لئے کافی ہے تا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔

انہیں مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنے زرخرید غلاموں (کہ واقعاً جنہوں نے دھوکہ کہایا) اور اپنے مختلف تجربوں، اور ان لوگوں کے ذریعہ کہ جن کے عقائد واقعاً ضعیف و کمزور ہیں مخفیانہ طور پر ذریعہ اپنے مقاصد کی طرف متوجہ کیا اور درج ذیل چیزوں کے ذریعہ اپنا کام شروع کیا۔

الف: دین کو سیاست سے جدا کرنے کی فکر رائج کرنا

دشمن کا سب سے پہلا کام دین کو سیاست اور حکومت سے جدا کرنے کی فکر کو رائج کرنا تھا اس مسئلہ کی تبلیغ کے لئے

راستہ بحد کافی ہموار تھا کیونکہ صدیوں سے مغرب اور یورپ میں اس سلسلہ میں کافی کام ہو چکا تھا بہت سی کتابیں لکھی گئیں کافی مقدار میں ریسرچ کی گئی تھیں جس کے نتیجہ میں مغربی ممالک میں یہ فکر رائج ہو چکی تھی کہ دین سیاست سے الگ ہے۔

اپنے اسی ہدف کو حاصل کرنے کے لئے ایران میں بھی راستہ ہموار کیا کہ کم از کم کچھ لوگوں کا یہ عقیدہ ہو کہ دین سیاست سے جدا اور الگ ہے اگر چہ اس کے لئے تھوڑا بہت راستہ پہلے سے ہی ہموار تھا کیونکہ انقلاب سے پہلے بھی اور انقلاب کے بعد بھی بعض وہ لوگ جو حکومت کے کارکنان تھے ایسا عقیدہ رکھتے تھے، ان کا اعتقاد یہ تھا کہ دین اور سیاست میں ایک بہت بڑی دیوار حائل ہے اور اس چیز کے پیش نظر تقریریں بھی ہوئیں، کتابیں بھی لکھی گئیں، چنانچہ اسی نظریہ کو مزید تقویت ان چیزوں کے ذریعہ جو مغربی ممالک میں کارگر ہو چکی تھیں اور یہ کوئی مشکل کام نہ تھا، دی گئی۔

پس معلوم یہ ہوا کہ دشمن کی ثقافتی کارکردگی میں سے ایک، دین کو سیاست سے جدا کرنے کی فکر رائج کرنا ہے، البتہ اس فکر سے تمام لوگ تحت تاثیر قرار نہ پائے کیونکہ جن حضرات نے اس اسلامی حکومت کے لئے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو قربان کیا تھا، مالی قربانی پیش کی ہے، اور تمام مشکلات کو برداشت کیا ہے، آسانی سے اس فکر سے متاثر نہیں ہونگے، کیونکہ ابھی تک ان کے کانوں میں امام خمینیؒ کی دل نشین آوازیں گونج رہی ہیں، اور مرحوم مدرسؒ کی یہ آواز کہ "دیانت ما عین سیاست ما است" (ہماری دینداری اور ہماری سیاست ایک ہی ہے) کو اتنی آسانی سے نہیں بھلا سکتے تھے۔

ب: ولایت فقیہ کا انکار

دشمن اور مغرب زدہ روشن فکری کی کارگردی کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ ملت میں یہ فکر ایجاد کریں کہ اگر چہ سیاست اور اجتماعی کاموں میں دین دخالت رکھتا ہے اور معاشرہ میں بھی اسلامی احکامات جاری ہونے چاہئے، اور سیاست میں بھی دینی امور کی طرف توجہ ہونا چاہئے، لیکن اسلامی حکومت کے معنی فقہاء کی حکومت نہیں ہے بلکہ اسلامی پارلیمینٹ میں قوانین کا طے ہونا کافی ہے، بعض قوانین کا دین کے خلاف نہ ہونا اسلامی حکومت کی تشکیل کے لئے کافی نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں دین کے مطابق قوانین جاری ہو گئے اور بس، اسلامی حکومت کے معنی اس کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔

پس دوسرا حصہ دشمن کی سیاست کا یہ تھا کہ اگر تمام لوگوں کو اس بات پر قانع نہ کر سکے کہ دین سیاست سے الگ ہے اور وہ اس بات کے قائل رہے کہ دین اور سیاست باہم ہیں تو ہم کہیں گے کہ دین اور سیاست باہم ہیں لیکن دینی حکومت کا مطلب یہ ہے کہ دینی احکام جاری ہوں، لیکن ان احکام کا مجری (جاری کرنے والا) کون ہے؟ اس مسئلہ کا دین سے کوئی ربط نہیں، بلکہ احکام دینی کو جاری کرنے کے لئے لوگوں نے جس کا انتخاب کر لیا وہی حاکم ہے، پس اسلامی حکومت کا مطلب اسلامی قوانین کا جاری کرنا ہے، نہ کہ حاکم متدین، مومن اور فقیہ ہو، یعنی دین کی سیاست میں دخالت کو قبول کرتے ہیں لیکن دین احکام کا مجری فقیہ اور مجتہد ہو اس کو قبول نہیں کرتے، یا یہ کہ حکوت کا سربراہ ولی فقیہ ہو، غیر قابل قبول ہے۔

اس سلسلہ میں (یعنی ولایت فقیہ کے ذریعہ حکومت نہ ہونے کے سلسہ میں) بہت کوششیں کیں اور اس وقت بھی ان

کی یہ کوشش جاری ہے، مختلف اخباروں، ماھناموں اور دیگر مختلف طریقوں سے ان مطالب کو منتشر کیا جارہا ہے اور اسی سلسلہ میں یونیورسٹی اور دوسرے مراکز میں میٹیگ کرتے رہتے ہیں تاکہ ابھی تک جو متدین حضرات دین کو سیاست سے جدا نہ ہونے کا نظریہ رکھتے ہیں ان کے ذھنوں میں یہ فکر ڈالیں کہ اسلامی حکومت قابل قبول ہے لیکن ولایت فقیہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اس قسم کا تبلیغی مشن، اسلامی احکامات اور فقہی بنیادوں سے نابلد جوانوں میں مؤثر ہوسکتا ہے خصوصاً جبکہ اس سلسلے میں ثقافتی وسائل کے ذریعہ بھرپور تبلیغات کی جائے، اور وسیع مالی امکانات کو اس کے لئے خرچ کیا جائے، لیکن پھر بھی ایسے افراد موجود ہیں جن پر ان کی تبلیغات کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اور ولایت فقیہ کو جیسا کہ قانون اساسی میں بھی اسی کو محور قرار دیا گیا ہے، اپنی تمام زندگی میں اہمیت دیتے ہیں اور جیسا کہ دنیا بھر میں یہ انقلاب، انقلابِ ولایت فقیہ، اور حکومت، حکومتِ ولایت فقیہ کے نام سے مشہور ہے، اور سبھی ولایت فقیہ کے پابند ہیں۔

ج۔ ولایت فقیہ کو موردِ اعتراض قرار دینا

ظاہر ہے کہ جو لوگ ولایت فقیہ کے قائل ہیں ان کے درمیان ان لوگوں نے نفوذ کرنے کا دوسرا طریقہ انتخاب کیا وہ اس طرح کہ لوگوں میں اس فکر کو رائج کیا جائے کہ ایران میں موجودہ ولایت فقیہ مخدوش (قابل اعتراض) ہے، اور اس پر تجدید نظر کی جانی چاہئے اور یہ ولایت فقیہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ڈیموکراسی (جمہوریت) اور لیبرالیزم کے اصولوں سے میل نہیں کھاتی، ولایت فقیہ کو اس طرح ہونا چاہئے کہ دور حاضر میں موجودہ ڈیموکراسی سے ہم آہنگ ہو، اور آج کی دنیا میں جو اصول وضوابط مسلم اور قابل قبول ہیں ان سے ولایت فقیہ متفق ہو، پس دشمن کی تیسری فکری سازش جمہوری اسلامی ایران میں ولایت فقیہ کو مخدوش کرنا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ عالمی استکبار اور دشمنِ اسلام عملی اور فکری تین طریقوں سے اس اسلامی حکومت کو ضعیف کرنا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے خاص پروگرام بھی بنائے اور آج بھی اس طرح کے پروگرام بناتے رہتے ہیں لیکن ان کی امیدیں آنے والی نسل تھی کہ جس لئے انہوں نے ایک لمبا فکری پروگرام بنا رکھا تھا۔

اور اس فکری پروگرام کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ دین کو سیاست سے دور ہونے کی فکر دے اس امید میں کہ ایک طبقہ اس کو قبول کرے گا۔

دوسرا نظریہ یہ پیش کیا کہ دین سیاست سے جدا نہیں ہے لیکن اسلامی حکومت کا ولایت فقیہ سے کوئی ربط نہیں ہے، یہ نظریہ بھی ایک طبقہ میں قابل قبول ہوسکتا ہے۔

تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جو لوگ ولایت فقیہ پر ایمان راسخ رکھتے ہیں ان میں یہ نظریہ رائج کریں کہ ولایت فقیہ مورد قبول ہے لیکن ایران میں جو ولایت فقیہ ہے اس کی فعلی صورت کو تبدیل ہونا چاہئے، خلاصہ دشمن ہر ممکن ذریعہ سے کوشش میں

ہے کہ جوانوں کے درمیان شک وشبہ پیدا کرے تا کہ اسلامی حکومت کے سلسلے میں ان کا اعتقاد ضعیف وکمزور ہوجائے، اور اگر ایسا ممکن ہوا تو پھر عالمی استکبار کے نفوذ کے لئے راستہ ہموار ہوجائے گا اور اسلامی معاشرے اور اسلامی حکومت میں نفوذ ہوجائے گا۔

جولوگ ان تینوں نظریات میں سے کسی ایک کا شکار ہو گئے چاہے وہ کسی بھی جگہ ہوں، کسی بھی مقام ومنزلت پر فائز ہوں گویا انھوں نے عالمی استکبار کی مدد اور نصرت کی اور استکبار کو اپنے اغراض ومقاصد تک پہنچنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

4۔ دشمن کی مذکورہ سازشوں کے مقابلے میں ہمارا وظیفہ

چونکہ دشمن نے مذکورہ سازشوں میں اپنی پوری طاقت صرف کی ہے لہٰذا وہ حضرات جو اس حکوت کو دل وجان سے چاہتے ہیں (اور الحمدللہ لوگوں کی اکثریت اس حکومت کو دل وجان سے چاہتی ہے اور اس کا نمونہ وہ عظیم مظاہرے ہوتے ہیں جو بعض موقع پر ہوتے رہتے ہیں اور تمام دنیا کو تعجب میں ڈال دیتے ہیں) ان لوگوں کو ہوشیار رہنا چاہئے کہ دشمن ان تین طریقوں سے ان کے درمیان نفوذ نہ کرے، اور ان کو ایسی کوشش کرنا چاہئے کہ جس سے لوگوں کا یہ عقیدہ راسخ تر ہوجائے کہ دین سیاست سے جدا نہیں ہے اور انہیں اس بات کا یقین ہوجائے کہ دوسرے ین اگر سیاست سے جدا ہوں تو ہوں، لیکن اسلام سیاست سے جدا نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ اپنے دلوں میں یہ نظریہ راسخ کرلیں کہ حکومتِ اسلامی کا مطلب فقط یہ نہیں کہ پارلیمینٹ میں اسلامی قوانین بن جائیں یا یہ کہ وہ قوانین اسلام کے مخالف نہ ہوں، بلکہ اسلامی حکومت کی حقیقت یہ ہے کہ قانوں کو جاری کرنے والے اسلام کے دلسوز اور اسلام کی پہچان رکھنے والے ہوں اور احکام الٰہی کو جاری کرنے میں اپنی پوری توجہ صرف کریں، ورنہ اگر قانون کاغذ پر لکھے جائیں اور اس کو جاری کرنے والے ہی ان قوانین کا پاس ولحاظ نہ رکھیں تو اس سے لوگوں کو کیا فائدہ ہو گا؟

کیا شاہ کے زمانے کے قوانین اساسی میں ایران کا رسمی مذہب شیعہ نہیں تھا؟ لیکن یہ قوانی کچھ بھی کارگر ثابت نہ ہوئے کیونکہ شاہ کی حکومت کافر اور دشمنوں سے بے حد متأثر تھی جس کی وجہ سے اسلامی قوانین پر عمل نہیں ہوتا تھا۔

اگر قوانین صرف کاغذ پر لکھے ہوئے ہوں اور ان کا جاری کرنے والا مومن ومتدین اور قدرتمند نہ ہو تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، لہٰذا اگر اسلامی پارلیمینٹ میں اسلامی قوانین بنائے جائیں لیکن جو شخص ان قوانین کی نظارت کررہا ہے وہ اسلام کا دلسوز نہ ہو اور اس قدر قدرت نہ رکھتا ہو کہ ان قوانین کو جاری کرسکے، تو ایسے قوانین کو جاری ہونے کی کوئی ضمانت نہیں ہے، لہٰذا دوسری ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم روز بروز ولایت فقیہ کے اعتقاد کو پختہ تر کریں، تا کہ ہمارے یقین میں بھی اضافہ ہو اور ہماری نسلوں میں بھی یہ عقیدہ باقی رہے کہ ولایت فقیہ کے بغیر اسلامی حکومت ناممکن ہے۔

ان دو مرحلوں کے بعد تیسرے مرحلے کی باری آتی ہے کہ یہ ولایت فقیہ کی موجودہ شکل وصورت جو اس وقت ایران

می تقریباً 20 سال سے ہے یہ وہی شکل وصورت ہے جس کو اہل بیت علیہم السلام نے بیان کیا ہے یا یہ کہ اس کی شکل وصورت کو عوض ہونا چاہئے؟

یہ تیسرا مرحلہ ایک فرعی مرحلہ ہے کہ جو گذشتہ دو مرحلوں کے بعد ہے لہٰذا پہلے ان دو مرحلوں پر بحث کرنا ضروری ہے اور انہیں دو مسئلوں کی بنیاد پر ہماری بحث اسلام کے سیاسی نظریہ کے تحت تشکیل پاتی ہے۔

5۔ دشمن کی سازشوں کے مقابلہ میں بہترین راستوں کا انتخاب

مذکورہ مطالب سے واضح ہوجاتا ہے کہ دشمن نے اپنی تمام تر طاقت اپنی مندرجہ ذیل سازشوں میں صرف کردی:

1۔ دین وسیاست میں جدائی کرنا۔

2۔ اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ میں جدائی کرنا۔

3۔ ایران میں ولایت فقیہ کی کارگردگی میں شک وتردید کا ایجاد کرنا۔

لہٰذا طبیعی طور پر ہمارا بھی تین گروہوں سے مقابلہ ہے پہلا گروہ وہ ہے کہ جس نے یہ قبول کرلیا ہے کہ دین سیاست سے جدا ہے یعنی مساجد، امامبارگاہ جدا ہیں اور سیاست وحکومت جدا ہے، لہٰذا ان لوگوں سے بحث کرنے کے لئے ہمیں ایک خاص راستہ اپنانا پڑے گا۔

دوسرا گروہ وہ ہے جس نے اسلامی حکومت کو تو قبول کیا ہے لیکن اس کے احکام کے مجری کے سلسلے میں چوں وچرا کرتے ہیں، ان لوگوں سے بحث کرنے کا انداز دوسرا ہونا چاہئے، کیونکہ اگر فرض کریں کہ کوئی خدا ہی کا قائل نہیں ہے تو اس سے بحث اس طرح شروع کی جائے تاکہ خدا کا اثبات ہوسکے اور اس کے بعد نبوت عامہ (تمام انبیاء کی نبوت) اور نبوت خاصہ (حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت) کے بارے میں بحث کی جائے لیکن اگر کوئی خدا اور بعض انبیاء کو قبول کرتا ہو لیکن حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا منکر ہو تو اس سے نبوت خاصہ کے سلسلہ میں بحث کی جائے گی۔

بہرحال جو لوگ خداوند عالم کو قبول کرتے ہیں لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو قبول نہیں کرتے تو آنحضرت کی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ پہلے خدا کے اثبات سے بحث شروع کی جائے کیونکہ اس کے لئے یہ طے شدہ ہے کہ کوئی خدا ہے اور اس نے انسانوں کی ہدایت کے لئے انبیاء کو بھیجا ہے اسی طرح دوسرے مسائل میں بھی مناسب راستہ اپنانا چاہئے اور جس سلسلہ میں ہم بحث کرنا چاہتے ہیں وہ ایسے اصول اور مقدمات پر موقوف ہے کہ بعض لوگ قبول کرتے ہیں اور بعض لوگ ان کو سرے سے قبول ہی نہیں کرتے۔

لہٰذا مذکورہ بحث کے سلسلہ میں ہمیں بھی چند طریقوں سے بحث کرنا ہوگی اور اس کے لئے مختلف روش درکار ہیں یعنی ممکن ہے بعض جگہ فقط عقلی دلیلوں کے ذریعہ اپنا مدعی ثابت کریں اور جس چیز کو انسان کی عقل درک کرتی ہے اس کے علاوہ کسی دوسری چیز کا سہارا نہ لیں، ایسی صورت میں عقلی برہانوں کے ذریعہ بحث کو آگے بڑھائیں گے بالکل اسی طرح کہ اگر کوئی خدا

کو نہ مانتا ہو اور اس کے سامنے خدا کے وجود کو ثابت کرنا ہو تو ایسے موقع پر قرآن اور معصومین علیہم اسلام کی احادیث کے ذریعہ اثبات کرنا بے فائدہ ہے کیونکہ وہ ابھی خدا کو ہی نہیں مانتا، تو قرآن وحدیث کو کس طرح قبول کرسکتا ہے؟!

اس کو سمجھانے کے لئے فقط عقل سے کام لینا پڑے گا اور اس کو عقلی دلیلوں کے ذریعہ خدا کے وجود کو ثابت کرنا ہوگا، اسی طرح جن لوگوں نے اسلامی حکومت کو قبول کیا ہے وہ لوگ ایک قدم آگے ہیں تو ان لوگوں سے بحث کرنے کے لئے ایسا راستہ اپنانا پڑے گا جو دینی باتیں قبول کرتے ہیں ان کے سامنے وہ دلیلیں بیان کریں جو محتوائے دین کو بیان کریں یعنی ان سے بحث کرنے کے لئے قرآن وحدیث اور تاریخی شواہد کو مدرک قرار دینا ہوگا۔

لیکن اگر حکومت کی کارگردگی کی بحث کی جائے تو تاریخی شواہد و مدارک کو مدنظر رکھ کر بحث کی جائے یہاں پر عقلی نقلی وتعبدی (قرآن وسنت) بحث نہیں ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ ہماری بحث بھی مختلف پہلو رکھتی ہے لہٰذا ہماری بحث بھی مختلف طریقوں سے ہوگی، بعض جگہ عقلی طریقہ سے بحث ہوگی اور بعض جگہ قرآن وحدیث کی روشنی میں بحث ہوگی، اور بعض دوسری جگہ پر تاریخ کا سہارا لیا جائے گا، یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ بعض افراد بحث کے درمیان ہم پر اعتراض نہ کریں کہ یہ بحث عقلی ہے یا شرعی؟ اس وجہ سے پہلے یہ عرض کردینا مناسب سمجھا کہ ہماری بحث کے مختلف طریقے ہوں گے، بحث کو اس کے مناسب طریقہ سے مورد تحقیق وبررسی قرار دیا جائے گا۔

6۔ دین کی تعریف اور اس کی حدود

یہاں پر ایک دوسرا مہم مسئلہ بھی ہے جس پر مستقل طور پر جداگانہ بحث ہوسکتی ہے لیکن اس وقت صرف اس کی طرف اشارہ کریں گے:

یہاں پر بحث یہ ہے کہ دین کی حدود کہاں تک ہیں؟ جس وقت ہم یہ بحث کرتے ہیں کہ حکومت ودین میں کیا ربط ہے اور دین وسیاست کا جدا کرنا صحیح ہے یا نہیں۔

تو سب سے پہلے خود دین کی معرفت حاصل کرنا ضروری ہے کہ دین کیا ہے دین کی صحیح تعریف ہمارے پاس ہونا چاہئے تاکہ اس کی بنیاد پر ہم اس کی حدود معین کرسکیں، اس سلسلے میں بعض لوگوں نے سعی فرمائی ہے مگر ایک دوسرے عنوان سے، وہ اس طرح کہ آیا انسان کو دین کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اس چیز کو مورد بحث قرار دیتے ہیں اور اس سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ دین کی انسان کی زندگی میں کیا دخالت ہے اس مرحلہ کی تحقیق وبررسی کے بعد ان لوگوں نے اس بحث کو مورد بحث قرار دیا کہ اسلام میں سیاست، دین کا جز ہے یا نہیں؟ بہرحال ان لوگوں نے اس سلسلہ میں بہت سی بحثیں کی ہیں، جیسا کہ آپ حضرات بھی ان بحثوں سے کم وبیش واقف ہیں۔

"مثلاً دین سے ہماری امیدیں" یعنی دین سے ہماری امیدیں حداقل درجہ پر ہیں یا حداکثر درجہ پر (یعنی کیا دین

انسان کی تمام زندگی کے مسائل کو شامل ہوتا ہے؟ یا یہ کہ انسان کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو شامل ہوتا ہے، بقیہ امور میں انسانی زندگی کے اکثر مسائل کو عقل وعلم اور لوگوں کی مرضی کے مطابق حل ہوتے ہیں) وہ حضرات جو دین کو حکومت سے الگ گردانتے ہیں جس وقت انہوں نے دین کی تعریف فرمائی تو ایسی تعریف کی جو سیکولریزم کے عقیدہ کے موافق تھی مثلاً دین کی یوں تعریف فرما کی کہ: دین یعنی انسان کا خدا سے معنوی رابطہ یا اس سے ایک قدم اور آگے رکھا اور کہا دین وہ چیز ہے کہ جو انسان کی آخرت (اگر آخرت کو قبول کرتا ہو) کی زندگی میں مؤثر اور کارگر ہو، یعنی دین کا کام یہ ہے کہ انسان کی زندگی کو آخرت سے ہم آہنگ کرے۔

اور یہ بات واضح ہے کہ اگر دین کی اس طرح تعریف کی جائے تو پھر یہ کہنا بہت آسان ہے کہ دین کا سیاست سے کیا رابطہ؟ سیاست کا خدا سے انسانی رابطہ کا کیا دخل؟ سیاست تو صرف انسانوں کے درمیان ایک دوسرے سے رابطہ کو بیان کرتی ہے، اور سیاست دین سے الگ ہے، سیاست انسان کی دنیاوی زندگی سے متعلق ہے اور اس کا عالم آخرت سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور اگر دین کی حدود صرف یہ ہوں کہ جہاں انسان کی عقل سمجھنے سے قاصر رہے اور جہاں عقل خود فیصلہ اور قضاوت نہ کرسکتی ہو تو پھر وہاں دین سے کوئی رابطہ نہیں کیونکہ دین کی حدود وہاں تک محدود ہیں کہ جہاں پر عقل کی رسائی اور پہنچ نہ ہو۔

لہٰذا اگر ہم نے دین کی مذکورہ تعریف کے مطابق اس کی حدود کو محدود کردیا اور اس بات کے قائل ہو گئے کہ جن مسائل کو ہماری عقل حل کرسکتی ہے وہاں دین کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور ہم کو دین کی ضرورت وہاں ہے کہ جہاں ہماری عقل مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے سے عاجز ہو، چنانچہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جارہا ہے اور انسان ترقی کررہا ہے دین کی ضرورت کم ہوتی جارہی ہے چونکہ اس بنیاد پر دین کی ضرورت وہاں ہے کہ جہاں عقل ان مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے سے عاجز ہے۔

چونکہ شروع میں انسان علم وتمدن نہیں رکھتا تھا، لہٰذا اس کو دین کی ضرورت بہت زیادہ تھی اور چونکہ انسان خود اپنی عقل سے مسائل کو نہیں سمجھ سکتا تھا لہٰذا اس کو دین کی ضرورت تھی اور آہستہ آہستہ اس کو دین کی ضرورت کم ہوتی گئی، اور اس آخری زمانہ میں انسان کو دین کی ضرورت تقریباً نہیں ہے، ہاں بعض ان جزئی مسائل میں ہے جن کو عقل انسان ابھی تک سمجھنے سے قاصر ہے اور کوئی امید بھی نہیں ہے کہ ان کو جلد ہی حل کرلیا جائے گا، ان مسائل میں ابھی بھی دین کی ضرورت ہے، (افسوس کہ یہ وہ لوگ ہیں جو مسلمان ہونے کا دعوی کرتے ہیں اور پھر یہ اعتراض اور اشکال کرتے ہیں کہ اس وقت چونکہ عقل بشری کامل ہوگئی ہے، لہٰذا اب دین ووحی کے قوانین کی ضرورت نہیں ہے) بہرحال مذکورہ دین کی تعریف کے مطابق نتیجہ یہ ہوگا کہ سیاست کا دین سے کوئی رابطہ نہیں ہے، اور جب ہم عقلی کوششوں اور عقلی استدلالوں کے ذریعہ تمام سیاسی مسائل کو حل کرسکتے ہیں، تو پھر دین کیا ضرورت ہے؟

المختصر یہ کہ اب تک جو ہم نے بیان کئے وہ اس سلسلے کے چند اعتراضات اور اشکالات تھے، اور اب ہم اس کا مختصراً جواب عرض کرتے ہیں اور شروع ہی گوش گذار کردیں کہ دین کی تعریف کی گئی ہے اور اس کی بنیاد پر دین کو فقط اخروی زندگی

سے مربوط اور خدا سے انسانی رابطہ مانتے ہیں ہماری نظر میں باطل اور بے بنیاد ہے، اور یہ نظریہ کہ دین سے سیاسی مسائل کا یعنی انسان کے سیاسی مسائل کا خدا سے کوئی ربط نہیں، یہ ساری چیزیں انسان اور خدا کے روحانی رابطہ سے جداگانہ ہیں، یہ بھی بے بنیاد اور بے ہودہ گفتگو ہے اور اس کا حقیقت دین سے کوئی ربط نہیں، یہ دین کی نامکمل تعریف ہے، بلکہ دین وہ طریقہ ہے جو انسان کو صحیح رفتار و کردار پر گامزن رکھے یعنی اس طرح انسان کو بنادے کہ جس طرح خدا چاہے، یعنی اگر انسان اپنے اعتقاد اور اپنی فردی و اجتماعی زندگی میں خدا کی مرضی کے مطابق قدم اٹھائے تو ایسا شخص دیندار ہے اور اسکے مقابل اگر انسان کا عقیدہ خدا کی مرضی کے مخالف ہو اور ان عقائد کو قبول کرے جو خدا کو ناپسند ہیں اور اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے اعمال و رفتار خدا پسندانہ نہ ہوں، تو اس کا دین بھی ناقص ہوگا، خلاصہ یہ کہ دین تمام مذکورہ چیزوں کو شامل ہے۔

7۔ دینی طریقوں سے دینی معرفت کی ضرورت

اگر ہم دین کی تعریف کرنا چاہیں تو ہمیں دیندار اور دینی بزرگوں کی تعریف دیکھنا ہوگا کہ ان حضرات نے دین کی کس طرح تعریف کی ہے؟ اور اگر ہم خود اپنے ذہن سے دین کی تعریف کریں اور من گھڑت تعریف کی بنا پر کہیں کہ سیاسی اور اجتماعی مسائل دین سے خارج ہیں یا یہ کہ سیاسی و اجتماعی مسائل کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے جیسا کہ دین کی ہم نے تعریف کی ہے نہ جیسا کہ خدا نے دین کو بھیجا ہے، پس ہمارے لئے ضروری ہے کہ دین خدا کی معرفت اور اسکو سمجھنے کے لئے خود اپنے طور وطریقہ اور اپنی فکر کے مطابق دین کی تعریف نہ کریں بلکہ دین کی معرفت اور شناخت کے لئے ضروری ہے کہ دینی منابع و مآخذ کے ذریعہ دین کے بارے میں تحقیق کریں۔

ہوسکتا ہے کہ کوئی یہ کہے: میں دین کو نہیں مانتا، کیونکہ اسلام کے صحیح ہونے پر جو دلیلیں قائم ہوئی ہیں وہ ضعیف ہیں یا (نعوذ باللہ) یہ کہے کہ ہمارے پاس اسلام کے جھوٹ اور باطل ہونے پر دلیل موجود ہے، اگر کوئی ایسا دعویٰ کرے، تو یہ دعوی منطقی اور صحیح نہیں ہے، البتہ اگر کوئی اسلام کو قبول کرے، اور پھر وہ کہے کہ جو میں کہتا ہوں وہی دین ہے نہ یہ کہ جو قرآن، پیغمبر اور ائمہؑ کہتے ہیں اور جس کے مسلمان معتقد ہیں، اگر کوئی اسلام کے حق یا ناحق ہونے کے بارے میں بحث کرے چاہے وہ اس کی طرفداری کرے یا اس کی ردّ کرے، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ اسلام کی معرفت اور پہچان حاصل کرے اور بے شک اسلام کی پہچان کے لئے خدا کے فرمان کی طرف رجوع کرے، جس نے اسلام کو بھیجا ہے، لہٰذا قرآن کے ذریعہ اسلام کو پہچانا جائے، اس حقیقت کے پیش نظر ہم نے کہا کہ دین کی پہچان، اس کی تعریف اور اس کی فرمانروائی کے دائرے کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ دینی منابع، یعنی قرآن وسنت کی طرف رجوع کریں، نہ یہ کہ اپنی مرضی کے مطابق یا کسی امریکن اور یورپین (کہ جن کی باتیں ہمارے نزدیک غیر معتبر ہیں) کے کہنے کے مطابق دین کی تعریف کریں۔

لہٰذا اگر کوئی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہے تو اسے چاہئے کہ اس اسلام کے مطابق گفتگو کرے جس کو قرآن، پیغمبر اور ائمہ علیہم السلام نے بیان کیا ہے، اور اسی اسلام کی بنیاد پر جس کی اصل قرآن وسنت ہے دین کی تعریف اور اس

کے فرمانروائی کے دائرے کو سمجھیں نہ یہ کہ کسی مستشرق (مشرقی زبان دان اور ماہر علوم)، مؤلف اور سیاست مدار کی غرض کے تحت اسلام کی تعریف شدہ تعریف کو اپنائیں یا کسی (یورپی) دائرۃ المعارف (معلومات عامہ کتاب) کے مطابق اسلام کی تعریف کریں ایسے اسلام سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اسلامِ حقیقی کے طرف رجوع کرنے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ دین کی فرمانروائی کا دائرہ انسان کی عقل وفہم پر ختم نہیں ہوتا بلکہ عقل، اسلامی شناخت کے طریقوں میں سے ایک ہے، اور اگر کوئی عربی زبان سے تھوڑی بھی واقفیت رکھتا ہو (اور قرآن کی تفسیر سے چاہے اجمالی ومختصر تفسیر سے آشنا ہو) جس وقت قرآن کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن نے اجتماعی مسائل کو نہیں چھوڑا اور ان کو بیان کیا ہے، پس کس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ دین سیاست سے جدا ہے۔

اگر دین کے معنی قرآن کے مطابق کئے جائیں تو دین میں اجتماعی اور سیاسی مسائل شامل ہیں اور اس میں عبادت وذاتی اخلاقیات کے علاوہ قوانین مدنی، قوانین جزائی (جرائم) اور عالمی قوانین موجود ہیں، اور گھریلو زندگی، شادی بیاہ، تربیت اولاد، کاروبار اور تجارت وغیرہ جیسے مسائل کو بیان کیا ہے، پس کون سی چیز ایسی ہے جو دین سے خارج ہے؟ معاملات، تجارت، اور رہن (گروی رکھنا) کے بارے میں قرآن مجید میں بڑی بڑی آیات موجود ہیں، اگر اسلام کو قرآن کے ذریعہ پہچانے تو پھر کس طرح کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسلام کا اجتماعی سے کیا ربط؟

اگر نکاح وطلاق دین کا جز نہ ہوں، اگر تجارت، رہن خرید وفروخت اور سود دین سے مربوط نہ ہوں، اسی طرح ولایت کا مسئلہ اور ولی امر کی اطاعت دین کا جز نہ ہوں تو پھر دین میں کیا باقی بچتا ہے؟! اور آپ کس دین کی باتیں کرتے ہیں؟ قرآن کریم نے مسلسل ان چیزوں کے بارے میں گفتگو کی ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ جس دین میں اجتماعی وسیاسی مسائل کو شامل کیا جائے ہم اس دین کو نہیں مانتے! ٹھیک ہے نہ مانئے، اسلام کو نہ ماننے والوں کی تعداد کوئی کم نہیں ہے، اس وقت بھی بہت سے لوگ دین کو نہیں مانتے، ہمارا ان سے کوئی جھگڑا نہیں، لیکن اگر وہ چاہتے ہیں تو آئیں اور ہم سے بحث کریں تا کہ اس اسلامِ کامل کو ان کے لئے ثابت کریں اور اگر نہیں چاہتے تو جو راستہ چاہیں اپنائیں:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ... [1]

"(اے رسول) تم کھدو کہ سچی بات (کلمۂ توحید) تمہارے پروردگار کی طرف سے (نازل ہوچکی ہے) بس جو چاہے مانے اور جو چاہے نہ مانے"

لیکن اگر وہ کہیں کہ ہم اسلام کو قبول کرتے ہیں لیکن پھر اسلام کو ان مسائل پر شامل ہونے کا انکار کرتے ہیں، اور

---

[1] سورۂ کہف آیت ۲۹

اسلام کے اکثر اجتماعی مسائل پر کیوں اعتراض کرتے ہیں؟ کیا جو کچھ قرآن وسنت میں موجود ہے اسلام نہیں ہے؟ کہ تم لوگ نہ نماز کو قبول کرتے ہو اور نہ ہی دوسری عبادتوں کو؟ تمہارا ایمان نہ اسلام کے اجتماعی مسائل پر ہے اور نہ ہی اس کے سیاسی مسائل پر، نہ تم اسلامی نکاح کو قبول کرتے ہو اور نہ ہی طلاق کو، اور اسی طرح دوسرے احکام کو قبول نہیں کرتے، تو پھر اسلام میں کیا چیز باقی ہے کہ جس اسلام کا تم دم بھرتے ہو وہ کیا ہے؟ یہ باتیں صرف سادہ لوح افراد کے لئے مؤثر ہوسکتی ہیں لیکن دانشمند اور پڑھے لکھے افراد کے لئے بے مایہ اور فضول ہیں، بہرحال دین یعنی انسانی زندگی الٰہی رنگ وڈھنگ کے ساتھ ہونا:

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۔ [1]

"(مسلمانوں سے کہدو کہ) رنگ تو خدا ہی کا رنگ ہے جس میں تم رنگے ہوئے ہو"

انسانی زندگی الٰہی رنگ وڈھنگ میں بھی ہوسکتی ہے اور شیطانی رنگ وڈھنگ میں بھی، لیکن اگر انسانی زندگی الٰہی رنگ وڈھنگ میں ہو تو پھر واقعاً اسلام کامل ہے، اگر ہم چاہیں کہ الٰہی رنگ وڈھنگ اور اس کی مرضی کے بارے میں گفتگو کریں تو پہلے ہمیں دینی منابع کو پہچاننا ضروری ہے اور اسلام کی شناخت کے لئے قرآن، سنت اور عقل کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے، اور یہی طریقے اسلام کے تمام عبادی، سیاسی، اجتماعی اور انفرادی مراحل کو شامل ہے۔

اور جیسا کہ ہم نے کہا کہ قرآن پر ایک سرسری نظر کافی ہے تاکہ ہمارے لئے یہ بات ثابت ہوجائے کہ وہ دین جو قرآن میں موجود ہے اور قرآن دین کا اصل منبع ہے، ممکن نہیں کہ اس اسلام میں سیاسی اور اجتماعی مسائل کو چھوڑ دیا گیا ہو اور قوانین کا مجموعہ سیاسی اور اجتماعی مسائل سے خالی ہو، یہاں تک کہ عبادی مسائل سے بھرپور ہو، اور یہ سلسلہ اسلام سے مرتبط نہیں ہے، کیونکہ وہ اسلام جو قرآن نے بیان کیا ہے ہم اس اسلام کا دفاع کرتے ہیں اور یہ اسلام سیاسی، اجتماعی اور عبادی مسائل کو شامل ہے اور سیاست اسلام کے مہم ارکان اور اس کے فرمانروائی کے اصل دائرے میں سے ہے، اور امریکن اور یورپین رائٹروں کے مطابق اسلام سے ہمارا کوئی ربط نہیں ہے اور اس کو حقیقی اسلام کی حقیقت سے دور اور اجنبی مانتے ہیں۔

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۱۳۸

تیسری نشست

دین میں سیاست کی اہمیت

(پہلا حصہ)

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

"اسلام کے سیاسی نظریہ" کی توضیح کے ضمن میں اسلامی منابع و مآخذ؛ یعنی قرآن، سنت اور عقل کے تحت ہم نے بیان کیا کہ اسلام نے انسانی زندگی کے اجتماعی وانفرادی مختلف مسائل میں نظریات بیان کئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام دنیاوی زندگی میں دخالت رکھتا ہے، اور ہم نے پہلے بھی عرض کیا کہ مختلف نظریات رکھنے والوں سے بحث کا طور وطریقہ بھی مختلف ہونا چاہئے، جو لوگ ہمارے ساتھ بعض عقیدوں میں شریک ہیں ان سے بحث کا طریقہ الگ ہے لیکن جو لوگ ہمارے اعتقادات کے مخالف ہیں ان سے بحث کا طریقہ الگ ہے اور ہم نے یہ بھی عرض کیا کہ مدمقابل کو قانع کرنے کے لئے کبھی برہانی اصولوں کو بنیاد بنایا جاتا ہے اور کبھی جَدَلی طریقہ اپنانا پڑتا ہے اور ہم اس کتاب میں دونوں طریقوں سے استفادہ کریں گے، اور ہم نے یہ بھی عرض کیا کہ اسلام سیاست کے بارے میں ایک خاص نظریہ رکھتا ہے اور ہمارے لئے ضروری ہے کہ اس نظریہ کو پہچانیں اور اس کو عملی جامہ پہنائیں، انقلاب اسلامی کے ارکان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ اسلام سیاسی مسائل میں دخالت رکھتا ہے، اسی وجہ سے ہمارا یہ انقلاب "اسلامی انقلاب" کے نام سے مشہور ہوا۔

اسی طرح ہم نے گذشتہ بحث میں بیان کیا کہ اسلام کے سیاسی نظریہ اور اس کے سیاسی پہلو سے دفاع کرنے میں ہمارے مقابل دو گروہ ہیں:

پہلا گروہ: ان لوگوں کا ہے کہ جو اسلام کو نہیں مانتے یا یہ کہ کسی بھی دین کو نہیں مانتے، ان لوگوں کے جواب کے لئے آیات وروایات سے دلیل پیش کرنا بے فائدہ ہے بلکہ ان سے مناظرہ کرنے کے لئے عقلی طریقہ اپنانا پڑے گا، اور سب سے پہلے اسلام کو ثابت کرنا پڑے گا تا کہ ثابت ہو سکے کہ خدا، دین، پیغمبر اور قیامت ہے، اور یہ مسلم ہے کہ اس گروہ سے (جو دین سے بے گانہ ہے) بحث کرنا صرف اعتقادی بحث ہوگی۔

دوسرا گروہ: ان لوگوں کا ہے کہ جو مسلمان ہیں اور دین کو قبول کرتے ہیں یا اگر اسلام پر اعتقاد نہیں ہے، مگر مسلمان ہونے کا دعوی کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا اسلام، سیاست سے بے گانہ ہے اور اسلام کا سیاست سے کوئی ربط نہیں ہے، اس گروہ کے مقابلہ میں ہم کو چاہئے کہ اس اسلام کی تحقیق و بررسی کریں جس کے مسلمان معتقد ہیں اور دیکھیں کہ

یہ اسلام سیاسی نظریہ رکھتا ہے یا نہیں؟ اس گروہ کے مقابلے میں ہمیں صرف عقلی روش سے استفادہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ اسلام کے سیاسی نظریہ کی شناخت کے لئے اسلامی اصولوں پر توجہ کریں جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے اور اس کے بعد اسلامی منابع؛ یعنی قرآن، سنت اور عقلی دلائل کے ذریعہ ثابت کریں کہ قرآن، سنت اور سیرت رسول اور ائمہ کی سیرت اور ان کے فرمان کے مطابق اسلام کا سیاسی نظریہ کیا ہے یہ کہ اسلام کی سیاسی دخالت پر بزرگان دین کی سیرت موجود ہے یا نہیں؟

2۔ سیاست کی تعریف اور اسلام میں تین طاقتوں کی اہمیت

ہم پہلے سیاست کی واضح وروشن تعریف کرتے ہیں تا کہ واضح وروشن ہوجائے کہ قرآن مجید میں سیاست کے بارے میں گفتگو موجود ہے یا نہیں؟

سیاست یعنی قوم وملت کو ادارہ کرنے کا طور وطریقہ، یا معاشرہ کو اس طرح تنظیم کیا جائے کہ اس کی ترقی اور پیشرفت ہو سکے، اور اس کے تمام مصالح اور ضروریات کو پورا کر سکے، یا بہ الفاظ دیگر: سیاست یعنی ملکی نظام چلانے کا قانون۔

البتہ سیاست سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ جس کے اثرات منفی ہوں یعنی جس میں فریب کاری، حیلہ بازی اور دوسروں کو دھوکہ دینا پایا جائے۔

سیاست اور ملکی نظام کے سلسلے میں "مانٹسکیو" کے زمانے سے حاکم گروپ کو تین طاقتوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

1۔ "قوۃ مقننہ، قانون گذار پاور (پارلیمینٹ)

2۔ "قوہ مجریہ"، قانون کو جاری کرنے والی طاقت (صدر یا وزیر اعظم)

3۔ "قوہ قضائیہ"، (عدالت یا کورٹ پاور)

قانون گذر پاور کی ذمہ داری یہ ہے کہ ملت کو ادارہ کرنے، اور ان کی مناسب وبہتر زندگی کے لئے قانون بنائے تا کہ عدل وانصاف برقرار رہے اور معاشرے پر نظام حکومت کر سکے، اور کوئی ایک دوسرے کے حقوق کو پامال نہ کر سکے، پوری قوم ترقی اور کامیابی کی طرف قدم بڑھاتی ہوئی نظر آئے، اور قوہ مجریہ کا وظیفہ یہ ہے کہ پارلیمینٹ میں بنائے گئے قوانین کو نافذ کرے اور یہی گروہ حکومت کی شکل پاتا ہے، قوہ قضائیہ کا کام یہ ہے کہ کلی قوانین کے تحت لوگوں کے درمیان موجودہ اختلافات اور جھگڑوں کا فیصلہ کرے۔

مذکورہ تقسیم بندی کے تحت جو وظائف تینوں طاقتوں کے لئے شمار کئے گئے ہیں ان کے بارے میں قرآن کے نظریات کیا ہیں اور شرعی لحاظ سے ان کی اہمیت کس قدر ہے اور کیا اس سلسلے میں قرآن اور اسلام نے کچھ خاص قوانین ودستورات بیان کئے ہیں؟ البتہ توجہ رہے کہ قوانین سے ہماری مراد اجتماعی قوانین ہیں نہ کہ انفرادی احکام وقوانین کہ جو دین میں مسلم ہیں۔

اجتماعی قوانین میں مدنی (شہری) قوانین، عدالتی قوانین، تجارتی قوانین اور حکومت کا لوگوں سے روابط کے ضوابط

نیز بین الاقوامی قوانین شامل ہیں، اگر ہم صحیح معنوں میں قرآن پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں مذکورہ تمام قوانین مل جائیں گے قرآن مجید میں شہری قوانین، نکاح وطلاق کے احکام، تجارت ومعاملات کے قوانین، قرض ورھن اور عدالت کے مسائل (یہ تمام چیزیں اس چیز کی حکایت کرتی ہیں کہ اسلام نے معاشرہ کو ادارہ کرنے کے لئے یہ احکامات پیش کئے ہیں) کے علاوہ قرآن مجید میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے خاص حقوق بیان کئے ہیں تا کہ خاص مواقع پر زمان ومکان کے پیش نظر کچھ احکام وضع کریں اور مومنین کو بھی حکم ہوا ہے تا کہ آنحضرت کی اطاعت وپیروی کریں، ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ط... [1]

"اور نہ کسی ایماندار مرد کو یہ مناسب ہے اور نہ کسی ایماندار عورت کو کہ جب خدا اور اس کے رسول کسی کام کا حکم دیں تو ان کو اپنے اس کام (کے کرنے یا نہ کرنے) کا اختیار ہو"

اس آیہ کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مومنین کو یہ حق نہیں ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی تصمیم وارادہ پر اعتراض کریں، پس معلوم یہ ہوا کہ خدا کے مسلم قوانین کے علاوہ اسلامی حکومت میں زندگی بسر کرنے والوں کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بنائے ہوئے قوانین بھی لازم الاجراء ہیں، یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کرنا ضروری ہے اور کسی کو بھی یہ حق نہیں کہ آنحضرت کی نافرمانی کرے، کیونکہ جو شخص آنحضرت کے قوانین کی مخالفت کرے وہ دو حالتوں سے خالی نہیں ہے:

1۔ یا تو وہ پیغمبر کو خدا کا رسول نہیں مانتا، ایسے شخص سے ہمارا کوئی مطلب نہیں ہے، ہم تو اس سے گفتگو کرتے ہیں جو آنحضرت کو خدا کا رسول مانتا ہو اور اس چیز کا بھی قائل ہو کہ آنحضرت کو خدا کی طرف سے قانون بنانے کا حق دیا گیا ہے، اسی وجہ سے خدا نے یہ نہیں فرمایا:

وَمَا كَانَ لِكَافِرٍ وَّلَا كَافِرَةٍ۔

بلکہ خداوند عالم کا ارشاد تو یہ ہے

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ۔ [2]

2۔ یا یہ کہ آنحضرت کی نبوت کا اعتقاد رکھتا ہے لیکن رسول اسلام کو اس طرح کا حق ملنے کے بارے میں بحث کرتا ہے؛ ایسے شخص کے لئے ہم قرآن مجید سے دلائل پیش کرتے ہیں کہ جس طرح اسلامی حکومت میں رہنے والے ہر مومن اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا معتقد انسان خدا کے احکامات کو لازم الاطاعۃ جانتا ہے بالکل اسی طرح سے رسول اسلام کے

---

[1] سورۂ احزاب آیت ۳۶

[2] سورۂ احزاب آیت ۳۶

بنائے ہوئے قوانین کو بھی لازم الاطاعۃ ماننا ضروری ہے اور تمام مومنین پر آنحضرت کی اطاعت وولایت ثابت شدہ ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ ۔ [1]

"نبی تو مومنین سے خود ان کی جانوں سے بھی بڑھ کر حق رکھتے ہیں"

پس قرآن کی نظر سے رسول اسلام کے لئے قانون کا بنانا اور اس کو اجراء کرنے کا حق مسلم الثبوت ہے،، لیکن یہاں پر یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا یہی مرتبہ رسول اسلام کے بعد کسی دوسرے کے لئے بھی ثابت ہے یا نہیں؟ البتہ اس بحث کو کسی دوسری جگہ پر کیا جائے گا اس وقت ہماری بحث اسلام کے بارے میں ہے کہ اسلام سیاسی نظریہ رکھتا ہے یا نہیں؟

3۔ عدالتی احکام قرآن کی نگاہ میں

قضاوت اور عدالتی احکام یعنی خدا کے کلی احکام کو اختلافی اور جھگڑے وغیرہ جیسے مسائل پر منطبق کرنا، اس سلسلے میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾ ۔ [2]

"پس (اے رسول) تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ سچے مومن نہ ہوں گے تاوقتیکہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم (نہ) بنائیں پھر (یہی نہیں بلکہ) جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے کسی طرح دل تنگ بھی نہ ہوں بلکہ خوش خوش ان کو مان لیں"

آیہ مذکورہ میں نہ صرف یہ کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے قضاوت ثابت ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قضاوت وداوری کو قبول کرنا شرط ایمان ہے، چونکہ آیت کے شروع میں قسم کھائی گئی ہے لہٰذا اس مطلب کی مزید تاکید ہوجاتی ہے کہ مومنین کو چاہئے کہ اختلافی مسائل میں آپ کے فیصلے اور حکم کو دل وجان سے قبول کریں، اور آپ کے دیئے ہوئے فیصلہ پر ناراض نہ ہوں، اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلہ پر اعتراض کیا اور اس کو دل وجان سے قبول نہ کیا تو پھر وہ حقیقی مومن نہیں ہے۔

جی ہاں! حقیقی مومن وہ ہے کہ اگر اسلامی حکومت اس کے برخلاف کوئی فیصلہ دے تو اس کو دل وجان سے قبول کرے اگرچہ یہ احتمال بھی ہو کہ اس کا حق ضایع ہوا ہے کیونکہ قاضی گواہوں اور دوسرے شواہد کی وجہ سے ظاہری حکم کرتا ہے جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا:

---

[1] سورۂ احزاب آیت ۶

[2] سورۂ نساء آیت ۶۵

"اِنَّمَا اَقْضِیْ بَیْنَکُمْ بِالْبَیِّنَاتِ وَالْاِیْمَانِ" [1]

میں تمہارے درمیان قسم اور دوسرے شواہد کی بنا پر فیصلہ کرتا ہوں۔

ممکن ہے کہ کوئی گواہ ظاہراً عادل اور معتبر ہو اور اس کی گواہی قبول ہو؛ اگر اس کی گواہی جھوٹ پر مشتمل ہو یا گواہ سے کوئی بھول چوک یا غلطی واقع ہوئی ہو لیکن اگر یہ طے قرار پائے کہ قاضی کے فیصلہ کو قبول نہ کیا جائے اگرچہ خلاف واقع بھی ہو تو پھر بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی اور اسلامی حکومت نہیں چل پائے گی۔

قرآن سے جو نتائج نکلتے ہیں اور قرآن مجید کا جزائی امور جیسے دیت، قصاص اور تعزیرات (سزا دینا) وغیرہ کا بیان اس بات پر گواہ ہے کہ اسلام سیاست وحکومت میں سب سے بڑی دخالت رکھتا ہے اور حد تو یہ ہے کہ اسلام نے مجرم اور مفسد کے لئے "حد" (اسلامی سزا) معین کی ہے اور قاضی کو اس حد تک اجازت دی ہے کہ مفسد اور مجرم پر حد جاری کرے اگرچہ کوئی مخصوص شکایت کرنے والا نہ ہو، چونکہ ایسی صورت میں گویا حقوق الٰہی کو پامال کیا گیا ہے (لہٰذا اس کو سزا دی گئی ہے)

بعض مقامات پر تو اسلام نے بہت سنگین اور سخت سزا معین کی ہیں کہ جس کی بنا پر بعض لوگوں کے لئے ان کا قبول کرنا مشکل ہو جاتا ہے، مثلاً قرآن مجید میں حکم ہوا کہ اگر اسلامی معاشرے میں کسی نے زنا کیا اور قاضی کے نزدیک چار عادل گواہوں نے گواہی دی اور وہ جرم قاضی کے نزدیک ثابت ہو چکا ہے تو زانی اور زانیہ میں سے ہر ایک سو سو تازیانے لگائے جائیں، اور قرآن نے اس سلسلہ میں خصوصی طور پر تاکید کی ہے تاکہ قاضی عواطف ومحبت سے متأثر نہ ہو، اور ان کے ساتھ مہربانی ومحبت سے پیش نہ آئے، ارشاد ہوتا ہے:

اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْکُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ ۔ [2]

"زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو (سو) کوڑے مارو اور اگر تم خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو حکم خدا کے نافذ کرنے میں تم کو ان کے بارے میں کسی طرح کا رحم کا لحاظ نہ ہونے پائے"

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کسی پر ایسی "حد" جاری ہو گئی تو اس کی عزت وآبرو ختم ہو جاتی ہے لیکن معاشرہ اور سماج ان تمام برائیوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

چوری کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا کَسَبَا نَکَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۔ [3]

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۲۷ ص ۲۳۲، اصول کافی جلد ۷ باب ان القضاء بالبینات والایمان حدیث نمبر ۱

[2] سورۂ نور آیت ۲

[3] سورہ مائدہ آیت ۳۸

"چور خواہ مرد ہو یا عورت تم ان کے کرتوت کی سزا میں ان کا (داہنا) ہاتھ کاٹ ڈالو، یہ (ان کی سزا) خدا کی طرف سے ہے اور خدا تو بڑا زبردست حکمت والا ہے"

پس نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن مجید نے رسول خدا کے لئے مقام قضاوت، قوم و معاشرے کی فلاح و بھبودی کے لئے حق قانون گذاری اور حدو سزا دینے کا حق معین فرمایا ہے، اگر کوئی شخص واقعاً انصاف رکھتا ہو اور قرآن اور معصومینؑ کی معتبر روایت پر ایمان رکھتا ہو اس پر یہ بات واضح و روشن ہو جاتی ہے کہ اسلام سیاسی و اجتماعی مسائل میں دخالت رکھتا ہے، لیکن اگر کوئی بغض و عناد کی وجہ سے ان حقائق سے چشم پوشی اور ان کا انکار کرے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چمکتے ہوئے سورج کا منکر ہو۔

4۔ سلام کا ہمہ گیر ہونا اور اسلامی حاکم کی اہمیت

قرآن مجید نے وسیع سیاسی مسائل، حکومتی قوانین، قانون گذاری اور اس کو خاص موارد پر منطبق کرنا اور قوانین کے اجراء کرنے کے علاوہ فرعی اور جزئی قوانین کے بارے میں بھی وضاحت کی ہے مثلاً سال کے مہینوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۔ [1]

"اس میں تو شک ہی نہیں کہ خدا نے جس دن آسمان و زمین کو پیدا کیا (اسی دن سے) خدا کے نزدیک خدا کی کتاب (لوح محفوظ) میں مہینوں کی گنتی بارہ مہینے ہے ان میں سے چار مہینے (ادب و) حرمت کے ہیں یہی دین سیدھی راہ ہے"

مذکورہ آیت میں سال کے بارہ مہینوں کی تقسیم تکوینی لحاظ سے اور خلقت کے نظام پر منطبق ہیں، اور اس طرح کے مطالب دین میں ذکر ہونا، دین کے صحیح اور مستحکم ہونے کی نشانی ہے، اسی طرح قرآن مجید میں چاند کو دیکھنے کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

يَسْـَٔـلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۔ [2]

"(اے رسول) تم سے لوگ چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں (کہ کیوں گھٹتا بڑھتا ہے) تم کہہ دو کہ اس سے لوگوں کے (دینوی امور اور حج کے اوقات معلوم ہوتے ہیں"

اس وجہ سے اجتماعی و عبادی احکام تکوینی نظام پر منطبق ہوتے ہیں اس کے علاوہ بہت سے حقوقی احکام ماہ رمضان کا آغاز، حج کا زمانہ اور دوسری عبادی احکام چاند دیکھنے پر متوقف ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید دین کو فطرت اور نظام خلقت سے ہم آہنگ اور منطبق بتاتا ہے:

---

[1] سورہ توبہ آیت ۳۶

[2] سورۂ بقرہ آیت ۱۸۹

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۔ [1]

"تو (اے رسول) تم باطل سے کترا کے اپنا رخ دین کی طرف کئے رہو، یہی خدا کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے خدا کی (درست کی ہوئی) فطرت میں (تغیر) تبدل نہیں ہوسکتا"

اور چونکہ الٰہی قوانین فطرت الٰہی کی بنیاد پر بنائے گئے ہیں لہٰذا یہ قوانین مسلم ہیں اور ان میں تبدیلی نہیں آسکتی، البتہ یہاں توجہ رکھنی چاہئے کہ اسلام کے بعض احکام وقوانین ایسے ہیں جو کسی خاص زمان ومکان کے لحاظ سے تبدیل ہو سکتے ہیں لیکن ان مسائل کو طے کرنا یا ان کو معین کرنا حاکم شرع کی ذمہ داری ہے، وہ حاکم شرع کہ جس کی مشروعیت اور طاقت خدا کی طرف سے ہے، قرآن مجید نے اس باعظمت منصب کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے مقرر فرمایا ہے اور شیعہ عقائد کے لحاظ سے ائمہ معصومین علیہم السلام کے لئے بھی یہ منصب ہے (جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے) اور ان کے بعد یہ مقام ولی فقیہ کے لئے معین ہوا ہے (ولی فقیہ کے بارے میں دوسرے موقع پر تفصیل سے بحث کریں گے، انشاء اللہ)

لہٰذا یہ اعتراض کہ دین کا اجتماعی مسائل سے کوئی مطلب نہیں، اور یہ کہ دین صرف آخرت سے مربوط ہے، یعنی انسان کے خدا سے رابطہ کا نام ہے یہ اعتراض بالکل ختم ہوجاتا ہے، اور نہ یہ اعتراض دین سے مربوط ہے، البتہ اس دنیا میں کوئی ایسا بھی دین ہوسکتا ہے کہ جس پر مذکورہ اعتراض وارد ہوسکتا ہو، لیکن ہماری بحث اس دین سے نہیں ہے، بلکہ ہماری گفتگو اس دین کے بارے میں ہے جس میں سال کے مہینوں تک کو بیان کر دیا گیا ہو جس میں معاملات اور مالی روابط کے بارے میں اس طرح تاکید کی گئی ہو کہ اگر کوئی شخص ایک دوسرے کو قرض دے تو اس کو لکھ لیا جائے یا دو گواہوں کے سامنے قرض دیا جائے، اور اگر لکھنا یا گواہ لینا ممکن نہ ہو تو کوئی چیز گروی رکھ لی جائے، (قرآن مجید میں رہن کے جواز کے بارے میں جو بیان ہوا ہے وہ ایسے ہی مقامات کے لئے کہ اگر کوئی شخص کسی کو قرض دے اور اس سے کوئی نوشتہ یا سند نہ لے سکے تو اس سے کوئی قیمتی چیز بعنوان گروی لے کر اس کو قرض دے دیا جائے)

لہٰذا ہم معتقد ہیں کہ دین اسلام سیاست، حکومت اور لوگوں کی مادی اور معنوی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے پروگرام رکھتا ہے۔

ہم نے گذشتہ جلسہ میں دین کی اس تعریف کو جس میں دین کو فقط انسان کے خدا سے رابطہ میں منحصر کیا گیا تھا اس کی ردّ کرتے ہوئے حقیقی دین کی تعریف کی تھی اور ہم نے عرض کیا تھا کہ دین کے صحیح معنی یہ ہیں کہ انسانی زندگی پر الٰہی جلوہ ہو جو انسان کے تکامل کا راستہ بیان کرے اور اس کو مبدأ ومعاد کی طرف متوجہ رکھے پس دین انہیں راستوں کے اختیار کرنے کا نام ہے اور بغیر کسی شک وشبہ کے ایسا دین زندگی کے کسی ایک حصہ مثلاً عبادت اور دوسرے عبادی کاموں میں منحصر نہیں ہوسکتا، بلکہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے کیونکہ انسان کی تخلیق کی وجہ یہ ہے کہ انسان ابدی اور ہمیشگی سعادت کو حاصل

---

[1] سورۂ روم آیت ۳۰

کر سکے اسی بنا پر اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو الٰہی احکامات سے ہم آہنگ کرے، لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کی براہ راست عبادت اور اصطلاحی عبادت دین کا بعض حصہ ہے اور ہماری زندگی کے دوسرے فکری و عملی پہلو خدا کی مرضی کے مطابق ہونا چاہئے، اور جب ہمارے سارے کام مرضی معبود کے مطابق ہو جائیں گے تو یہ تمام کام بھی عبادت بن جائیں گے اور انسان اس طرح زندگی کے بلند ترین مرتبہ پر پہنچ جائے گا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ [1]

"اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اسی غرض سے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں"

اس آیت کا مطلب یہ کہ انسان خدا کی عبادت و پرستش کی بنا پر کمال کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

لہٰذا انسان کے تمام اعمال و افعال اسی قاعدے اور قانون کے تحت ہونا چاہئے، یہاں تک کہ اس کا سانس لینا بھی اسی قاعدہ کے تحت ہونا چاہئے اور اگر انسانی زندگی نے الٰہی رنگ کو اپنا لیا ہے اور اسی سانچہ میں ڈھل گیا، تو وہ انسان واقعاً دیندار ہے اور اگر خدا کی عبادت اور اس کی پرستش کے دائرے سے خارج ہو گیا تو وہ شخص بے دین اور مرتد ہو جائے گا، وہ لوگ جن کی زندگی کا بعض حصہ خدا کی مرضی کے خلاف ہو اور خدا کی عبادت سے بے خبر رہتے ہیں، وہ لوگ واقعی دیندار نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ارتداد کی سرحد پر رہتے ہیں ان لوگوں کا دین ناقص ہے، کیونکہ دین کے ناقص ہونے کے بھی درجات ہیں لہٰذا ہم کو یہ یقین رکھنا چاہئے کہ جو حضرات واقعاً دیندار ہیں اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں احکامات الٰہی کی رعایت کرتے ہیں، پس وہ لوگ جو زندگی کے بعض حصوں میں احکام الٰہی کی رعایت کرتے ہیں وہ ان کے مرتبہ کے برابر نہیں ہیں، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ ایمان اور دینداری کے بھی بہت سے مراتب اور درجات ہیں اور انسان ان میں ترقی کر سکتا ہے جیسا کہ خدا وند عالم ارشاد فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ۔ [2]

"اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں ان کو خدا (قرآن کے ذریعہ) مزید ہدایت کرتا ہے اور ان کو پرہیزگاری عطا کرتا ہے"

جو لوگ ہدایت پا چکے ہیں خدا وند عالم ان کی ہدایت اور تقوے میں اضافہ کرتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا۔ [3]

---

[1] سورۂ ذاریات آیت ۵۶

[2] سورۂ محمد آیت ۱۷

[3] سورۂ انفال آیت ۲

"سچے ایماندار تو بس وہی لوگ ہیں کہ جب (ان کے سامنے) خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ہل جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان کو اور بھی زیادہ کر دیتی ہیں"

جی ہاں ایسے بعض حضرات موجود ہیں جن کے ایمان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور تکامل کی طرف بڑھتے رہتے ہیں تا کہ ایمان کی بلند منزلوں تک پہنچ سکیں اور اولیاء الٰہی میں شمار ہونے لگیں، ان کے مقابلہ میں وہ لوگ ہیں جو پستی کی طرف جاتے رہتے ہیں اور دینداری میں پیچھے ہٹتے چلے جاتے ہیں اور کبھی کبھی اغیار و بے گانوں کے اعتراضات و اشکالات کو سن کر نامناسب ماحول کی طرف بڑھ جاتے ہیں اور جس دین کو ماں باپ یا کسی استاد سے سیکھا تھا اس کو کھو بیٹھتے ہیں، کیونکہ جن لوگوں میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ مسائل کو اچھے طریقہ سے سمجھ سکیں اگر وہ اعتراضات و اشکالات میں وارد ہوتے ہیں تو منحرف ہو جاتے ہیں، قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے:

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۚ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ.... [1]

"(مسلمانو!) حالانکہ خدا تم پر اپنی کتاب قرآن میں حکم نازل کر چکا ہے کہ جب تم سن لو کہ خدا کی آیتوں کا انکار کیا جاتا ہے اور اس سے مسخراپن کیا جاتا ہے تو تم ان (کفار) کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں غور کرنے لگیں اور تم بھی اس وقت ان کے برابر ہو جاؤ گے"

انسان کو چاہئے کہ پہلے اپنے علم اور عقلی و فکری بنیادوں میں اضافہ کرے اور اعتراضوں کے جوابات اور ان کا تجزیہ و تحقیق کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرے، اس کے بعد کسی کے اعتراضات و شبہات پر کان دھرے، اور دوسرے کے اعتراض کو سن کر خود کو انحرافات کے خطرے میں نہ ڈالے، اسلام یہ نہیں کہتا کہ کسی سے کشتی نہ لڑو، بلکہ اسلام کی نظر تو یہ ہے کہ پہلے کشتی کے فن سے واقف ہو جاؤ بعد میں کشتی لڑو، اور اگر چاہو کہ کسی بھاری پہلوان سے کشتی لڑو تو پہلے اپنے وزن اور پرکٹس میں اضافہ کرو اسی طرح اسلام یہ نہیں کہتا کہ دوسروں کے اعتراضات کو نہ سنو بلکہ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ جس قدر اشکالات و اعتراضات کی تجزیہ و تحقیق اور تشخیص کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو، وہاں تک اشکالات کو سنو، یعنی پہلے معارف الٰہی حاصل کرو پھر شبہات کے جوابات دینے کا طریقہ سیکھو اس کے بعد دوسروں سے بحث و مناظرہ کرو تا کہ دشمن تم کو شکست نہ دے سکے اور اپنے عقائد کو تم پر تھوپ نہ کر سکے۔

5۔ مذکورہ بحث کا خلاصہ

ہماری بحث و گفتگو کا خلاصہ یہ ہوا کہ اسلام، تمام سیاسی پہلوؤں پر شامل ہوتا ہے لہٰذا ہماری تمام زندگی دین کے مطابق ہونا چاہئے، زندگی کا کوئی بھی گوشہ دین سے خارج نہ ہو؛ چاہے وہ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی، خاندانی زندگی ہو

[1] سورۂ نساء آیت ۱۴۰

یا ازدواجی مشترکہ زندگی، ماں باپ سے اولاد کے روابط ہوں یا امت اور امام کا رابطہ، یہاں تک کہ دوسرے مذاہب سے رابطہ کیسا ہونا چاہئے کن افراد سے رابطہ رکھنا صحیح ہے اور کن لوگوں سے رابطہ رکھنا صحیح نہیں ہے، اور اگر ہم قرآنِ مجید کی آیات پر ایک نظر ڈالیں (درحالانکہ روایات کی طرف رجوع بھی نہ کریں)

تو جو شخص تھوڑا بھی انصاف رکھتا ہو اس کے لئے واضح و روشن ہو جائے گا کہ سیاست اسلام کا متن (اصلی رکن) ہے اور ہم بغیر سیاست کے اسلام نہیں رکھتے، اور کچھ لوگ اسلام کو سیاست سے جدا تصور کریں تو گویا ان کا دین دوسرا ہے اور اس کو اسلام کا نام دے دیا ہے وہ اسلام کہ جس کی اصل قرآن و سنت ہے اس کا سیاست سے جدا ہونا ممکن نہیں ہے۔

چوتھی نشست

دین میں سیاست کی اہمیت

(دوسرا حصہ)

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

گذشتہ نشستوں میں عرض کیا جاچکا ہے کہ ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی اور اسلامی حکومت کے قیام کے بعد، اسلام دشمن طاقتیں اپنی پوری جد جھد اور تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچیں کہ اس اسلامی حکومت سے مقابلہ کے لئے انقلاب کی بنیادی اور مرکزی چیز کا مطالعہ کیا جائے جو "ولی فقیہ" کی ولایت وسرپرستی ہے، اور اس کو اپنے پروپیگنڈے کی تیز دھار کا نشانہ بنایا جائے، چنانچہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ گذشتہ چند سالوں سے عصر حاضر تک اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ پر دنیا بھر سے مختلف اعتراض ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح دشمن طاقتوں کے نمائندے ملک میں ولایت فقیہ کے برخلاف تمام تر کوششوں میں مشغول ہیں، ان تمام باتوں کے باوجود اگر چہ ہماری قوم وملت ولایت فقیہ کی حکومت پر بھرپور اعتماد وایمان رکھتی ہے، اور اس حکومت کی ہر اعتبار سے حمایت کرتے ہیں لیکن پھر بھی ضروری ہے کہ مذکورہ مسائل کے بارے میں تفصیلی بحث کی جائے تا کہ اس حکومت کی نظری اور فکری بنیادیں عوام اور بالخصوص جوان نسل کے لئے واضح وروشن ہوجائیں۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ اس سلسلے میں تین طرح کے اعتراض کئے جاتے ہیں:

پہلا اعتراض:

پہلا اعتراض یہ ہے کہ دین کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور ایک سیاسی لظام کسی بھی صورت میں دینی نہیں ہو سکتا، گذشتہ جلسہ میں ہم نے اس اعتراض کا جواب دیا کہ اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ اسلام ایک دین اور مذہب ہونے کے عنوان سے کسی سیاست سے منسلک ہے یا نہیں؟ تو اس کے جواب کیلئے قرآن مجید کا اور اس میں بیان کئے گئے احکام وقوانین کا ایک سطحی اور سرسری مطالعہ کافی ہے اور حقیقت میں جو شخص مسلمان ہے اور قرآن پر اعتقاد رکھتا ہے اور اسی طرح وہ شخص جو مسلمان نہیں ہے، لیکن اسلام کی شناخت اور معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو قرآن مجید کی طرف رجوع کرنا چاہئے، تب اس پر یہ حقیقت واضح ہوجائیگی کہ دین اور سیاست کا ایک دوسرے سے جدا ہونا ناممکن ہے۔

اور یہ بات بھی واضح ہے کہ اسلام کی پہچان کا صحیح طریقہ قرآن مجید ہے، جس طرح اگر ہم چاہیں کہ کسی ایک موضوع کے بارے میں عیسائیت کا نظریہ معلوم کریں تو اس کیلئے ہمیں انجیل کا مطالعہ کرنا پڑے گا، البتہ ہم نے جو کچھ بیان کیا یہ ان

لوگوں کیلئے ہے جو مسائل کو سمجھنے کیلئے صحیح اور منطقی طریقہ اپنائیں چاہے بحث وگفتگو ہو چاہے مطالعہ تحقیق و بررسی ہو، صحیح طریقے کا انتخاب کریں، لیکن دشمن بحث وگفتگو کیلئے صحیح اور منطقی طریقوں سے دور بھاگتا ہے کیونکہ ان کا مقصد صرف مومنوں میں اعتراضات اور شبہات پیدا کرنا ہوتا ہے، تاکہ ان کے ایمان کو ناقص کردیں چونکہ ان کی بحث وگفتگو منطقی نہیں ہوتی کہ ہم اس کا جواب دیں، لیکن پھر بھی اپنا وظیفہ سمجھتے ہیں کہ ان کے اعتراضات اور شبہات کا منطقی جواب دیں۔

2۔ کیا دین سیاست سے جدا ہے؟ (مذہبی وغیر مذہبی لوگوں کا نظریہ)

جن لوگوں نے دین کو سیاست اور حکومت سے ہونے میں غیر مذہبی نظریہ کو انتخاب کیا ہے، وہ لوگ کہتے ہیں۔ ہم کو قرآن سے کوئی مطلب نہیں اور اسلام پر غیر مذہبی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس سے پہلے کہ ہم اسلامی منابع و ماخذ کی تحقیق و بررسی کریں یا یہ دیکھیں کہ قرآن سیاست سے متعلق کیا کہتا ہے، یہ سوال کرتے ہیں کہ انسان کو دین کی کیا ضروت ہے؟ اور کن مسائل میں اس کو دین کی راہنمائی کی ضروت ہے؟

انہوں نے اس مسئلہ سے متعلق اپنے خیال خام میں دو نظریہ فرض کیئے ہیں، پہلا فرض یہ ہے کہ انسان تمام چیزوں میں اور زندگی کے تمام امور میں دین کی ضروت رکھتا ہو، مثلاً کس طریقہ سے غذا آمادہ کی جائے اور کس طرح سے کھائی جائے، یا کسی طرح مکان بنایا جائے، شادی بیاہ کے کیا طریقے ہیں اور حکومت اور جامعہ کی تشکیل کو ایک ہی صف میں رکھا ہے، اور اس طرح کہتے ہیں، کیا دین کیلئے ضروری ہے کہ ان تمام مسائل کو حل کرے، اور انسان کو علمی اور دقیق مسائل کی تحقیق کرنے کی کوئی ضروت نہیں ہے، اور ہم کو اکثر مسائل میں دین کا منتظر نہیں اپنا چاہیئے کہ ہر چیز کی وضاحت دین ہی سے طلب کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم کوئی لباس بنانا چاہیں تو پہلے یہ معلوم کریں اسلام کا نظریہ کیا ہے، اور اگر کھانا کھانا چاہیں تو دیکھیں کہ اسلام نے کن کھانوں کی اجازت دی ہے، اور اگر بیمار ہوجائیں اور ڈاکٹر کے پاس جانا پڑے تو دیکھیں کہ اسلام نے اس سلسلے میں کیا وصیت کی ہے؟ نیز اس طرح اسلام نے حکومت اور سیاست کے بارے میں کیا نظریہ پیش کیا ہے۔

دوسرے فرض یہ ہے کہ دین فقط بعض چیزوں میں دخالت رکھتا ہے اور دین سے ہماری توقعات حداقل درجہ پر ہونی چاہئے اور یہ بات طبیعی ہے کہ دین ہر اعتبار سے انسان کی ضروریات میں نظر نہیں رکھتا، بلکہ کوئی بھی دین یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ انسان کی تمام ضروریات پورا کرسکتا ہے۔

اور جب ہم نے یہ مشاہدہ کرلیا کہ دین ہم کو کھانا بنانا، علاج کرنا، ہوائی جہاز اور کشتی بنانا وغیرہ نہیں سکھاتا تو اب ہم کو یہ دیکھنا ہوگا، وہ مسائل کہ جن کو اپنے سے بیان کیا ہے ان کا دوسرے مسائل سے بھی کیا امتیاز ہے، اور اصلا دین نے کس کس میدان میں وارد ہوا ہے۔

یہ لوگ اپنے خیال خام میں اس نتیجہ پر پہنچے کہ ایک دوسری قسم کو انتخاب کریں اور وہ یہ ہے کہ دین فقط دینی امور میں ہے دنیاوی امور سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور دین سے ہماری توقعات کم سے کم ہونی چاہئے اور ہم کو چاہیئے کہ جن کے ذریعہ فقط

ان چیزوں اور طریقوں کو پہچانیں کہ جن کے ذریعہ آخرت میں کامیابی، جنت میں جانے، دوزخ سے نجات حاصل کی جاسکے۔ جیسے نماز پڑھنا، روزہ، رکھنا، حج کوانجام دینااور دوسرے عبادی امور کودین سے حاصل کریں۔

ان لوگوں نے اپنے خیال خام میں دین وسیاست کے ربط کواس طرح حاصل کیا ہے کہ دین سیاست سے جدا ہے اور یہ کہا کہ سیاست کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے اور یہ کہ سیاست کا دائرہ دنیوی امور میں ہے، اور دین کا دائرہ آخرت سے مربوط ہے، نہ دین کوسیاست میں دخالت کرنا چاہیے اور نہ ہی سیاست کودین میں دخالت کرنی چاہیے۔

لہٰذا سیاست وہ ہے کہ جس کا تعلق دنیا اور علم سے ہے، لہٰذا سیاست کو فقط علم اور انسانی ترقی میں دخالت کا حق ہے چاہے اس علم کا تعلق کسی شعبہ ہائے زندگی سے ہو، دنیاوی علوم میں دین کی کوئی دخالت نہیں ہے، دین کی دخالت صرف اُخروی امور میں ہے۔

ان مسائل کا تاریچہ چندصدی پہلے مغربی مما لک کی طرف پلٹتا ہے کہ جس وقت کلیسائی پادریوں اور علم وسیاست کے لوگوں کے درمیان اختلاف اور تضاد پیدا ہوا، اور آپس میں مدتوں تک اسی سلسلے میں جنگ وجدال ہوتی رہی، اور آخر میں ان کی یہ جنگ وجدال ایک عجیب صلح پر تمام ہوئی، جس میں یہ طے پایا کہ دین فقط آخرت سے تعلق رکھتا ہے دین بھی انسان کا خدا سے رابطہ، اور دنیادی کاموں میں دخالت کرنا اہل سیاست اور اصل علم افراد کے سپرد کیا گیا۔

یہ تمام نظریات مغربی مما لک کے تھے، لیکن بعد میں جولوگ ان کے تحت تاثیر قرار پائے ان کا کہنا ہے کہ ہمارے اسلامی مما لک میں بھی اس طرح تقسیم ہونا چاہئے مثال کے طور پر اس طرح ہونا چاہئے کہ دین کی باگ ڈور فقط دینی علماء کے ہاتھوں میں ہواوران کا نام صرف ضروری کاموں میں حق دخالت ہو، اور دین یا دینی علماء دنیاوی کاموں کو بالکل دخالت نہ کریں، لھذا سیاست کواہل سیاست حضرات پر چھوڑ دیا جائے اور دینی علماء اور فقہاء کوسیاست میں دخالت کا کوئی حق نہیں، اور اس سلسلے میں بہت سی تقریریں ہوئی، مقالات لکھے گئے، اور اپنے اس نظریہ کی تائید کیلئے ہر ممکن کوشش کی گئی تاکہ ہمارے جوانوں کے درمیان اس اعتراض کورائج کریں اور اس نظریہ کوتقویت پہنچائیں کہ دین سیاست سے جدا ہیں۔

افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ بعض پڑھے لکھے افراد ناخواستہ طوران کے نظریہ کے تحت تاثیر قرار پائے، اور آہستہ آہستہ یہ نظریہ لوگوں کے ذہن میں اپنا مقام بناتا جارہا ہے، کہ دین، دنیا کے مقابلہ میں ہے یعنی دین انسانی زندگی کے بعض مسائل کوحل کرسکتا ہے اور دنیاوی امور کا دین سے کوئی رابطہ نہیں، اور جب یہ اعتراضات اور شبہات ہمارے پڑھے لکھے اور مولفین اور مقررین حضرات کے ذریعہ بیان ہوتے ہیں تو واقعاً یہ ہماری ملت اور جامعہ کیلئے ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔

3۔ دنیا اور آخرت میں چولی دامن کا رابطہ ہے

حقیقت یہ ہے کہ اگر چہ ہماری یہ زندگی دوحصوں میں تقسیم ہوتی ہے دنیاوی زندگی، افروی زندگی، یعنی دنیا میں ہماری زندگی کا ایک حصہ روز پیدائش سے شروع ہوتا ہے اور موت پر ختم ہوجاتا ہے اس کہ بعد دوسری زندگی عالم برزخ اور عالم

قیامت میں شروع ہوتی ہے، البتہ اس کے علاوہ بھی ایک دوسری زندگی فرض کی جاسکتی ہے اور وہ ہے عالم جنین) لیکن زندگی کی تقسیم کا ملازمہ یہ نہیں ہے کہ ہماری چال چلن دو حصوں میں تقسیم ہو جائے اور دو نظریوں سے دیکھا جائے، بہر حال اس وقت ہم دنیا میں ہیں اور اس دنیا میں دن بھر ہم بہت سے امور انجام دیتے رہتے ہیں دین اس وجہ سے آیا ہے تا کہ ہمارے امور کو سلیقہ عطا کرے، اور اپنے دستوری اور تشریعی نظام کے ذریعہ ہماری رہنما کی کرے، نہ یہ کہ دینی قوانین صرف مرنے کے بعد کیلئے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ ہماری 50 یا 60 سال کی عمر کا بعض حصہ دنیا سے مربوط ہو اور بعض حصہ آخرت سے، بلکہ ہماری نظر میں دنیا کی کوئی بھی چیز ایسی نہیں ھے جو آخرت سے مربوط نہ ہو، بلکہ ہمارے تمام دنیاوی امور ایک طرح سے آخرت سے مربوط ہو سکتے ہیں یعنی دنیاوی امور اس طرح سے انجام پائیں کہ آخرت میں مفید ثابت ہوں، اور ہوسکتا یہی اعمال ہمارے آخرت کے لئے مضر اور نقصان دہ ثابت ہوں، بہر حال گفتگو یہ ہے کہ ہمارے اعمال وافعال آخرت کیلئے مؤثر ہیں اور بنیادی طور پر اسلامی نظریہ بھی یہی ہے کہ آخرت کی زندگی کو اسی دنیا میں سنوارا جاتا ہے:

"الیوم عملٌ ولا حساب وغداً حسابٌ ولا عمل"[1]

آج کا دن عمل کرنے کا دن ہے حساب کا نہیں اور روز قیامت حساب کا دن ہے وہاں عمل کی جگہ نہیں ہے۔

"الدنیا مزرعة الاخرة"[2]

دنیا آخرت کی کھیتی ہے (جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے لہٰذا جو کام ہم دنیا میں کریں گے آخرت میں اسی طرح بدلا ملے گا، اور ایسا نہیں ہے کہ دنیاوی زندگی کا اخروی زندگی سے کوئی رابطہ نہیں ہے یا ہماری زندگی کا کچھ حصہ دنیا سے اور کچھ حصہ آخرت سے متعلق ہے، یعنی ہماری زندگی کے الگ الگ شعبے نہیں ہیں، بلکہ اس دنیا میں ہمارے کام اس طرح ہونا چاہئے تا کہ ہمیں آخرت میں سعادت اور کامیابی نصیب ہو مثلاً ہمارا اٹھنا بیٹھنا، سانس لینا، دیکھنا، سننا، گفتگو کرنا، کھانا پینا، میاں بیوں کے تعلقات اور اجتماعی روابط اس طرح ہوں کہ ہماری آخرت سنور جائے، اور ہوسکتا ہے ہمارے یہی کام آخرت میں مضر اور نقصان دہ ہوں، یہ بات مسلم ہے کہ کھانا پکانا اور کھانا کھانا دنیا سے مربوط ہے لیکن ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کھانے کا یہی طریقہ جنت میں جانے کا باعث بنے اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ہمارے لیئے باعث عذاب ہو

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ نَارًا ؕ وَ سَیَصۡلَوۡنَ سَعِیۡرًا ۔[3]

"بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق چٹ کر جایا کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں بس انگارے بھرتے ہیں اور

---

[1] بحار الانوار ج ۳۲ ص ۳۵۴

[2] بحار الانوار ج ۷۰ ص ۲۲۵

[3] سورۂ نساء آیت ۱۰

عنقریب واصل جہنم ہونگے"

جو شخص اپنے پیٹ کو یتیموں کے مال سے بھرتا ہے اگر چہ وہ ظاہراً کھانا کھاتا ہے اور اس سے لذت بھی اٹھاتا ہے لیکن یہی کھانا جو کھا رہا ہے اس کے لئے جہنم کا عذاب بن جائے گا، جس طرح اگر انسان خدا کی عبادت کرنے کے لئے کھانا کھاتا ہے تو اسکا یہی کھانا آخرت میں ثواب واجر کا باعث ہے اسی طرح اگر انسان خدا کی خوشنودی کے لئے گفتگو کرتا ہے تو جنت میں اس کے لئے ایک درخت لگایا جاتا ہے۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا: جو شخص بھی تسبیحات اربعہ پڑھے، خداوند عالم اس کے لئے جنت میں ایک درخت اُگاتا ہے (یہ سننے کے بعد)

بعض لوگوں نے کہا: تب تو ہمارے لئے جنت میں بہت سے درخت موجود ہوں گے، کیونکہ ہم تسبیحات اربعہ کو مکرر پڑھتے رہتے ہیں۔

اس موقع پر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ٹھیک ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ ان کو جلانے کے لئے وہاں آگ نہ بھیجو۔

لہٰذا اگر ہمارے اعمال وکردار خدا کی خوشنودی کے لئے ہوں تو آخرت کی سعادت وکامیابی کا سبب ہوں گے، اور اگر ہمارے یہی اعمال خدا کی مرضی کے خلاف ہوں تو آخرت میں بدبختی اور عذاب جہنم کے باعث بنتے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ ہماری یہ زندگی دو مستقل حصوں پر مشتمل ہو جس کا ایک حصہ آخرت سے مربوط ہو اور مسجد وعبادت گاہوں میں گذارا جائے اور دوسرا حصہ ہماری دنیا سے مربوط ہو جس کا آخرت سے کوئی سروکار نہ ہو۔

اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ یہ نظریہ (دین کی حدود صرف انفرادی، عبادی مسائل اور عبادتگاہ تک ہوں کہ جس کا ثمرہ آخرت میں ظاہر ہوگا اور دوسرے مسائل دین سے خارج ہیں) آخری چند صدی کے درمیان بعض مغربی لوگوں میں بعض ادیان کے ماننے والوں کی طرف سے رائج ہوا ہے اور اس نظریہ نے بہت سے لوگوں کے ذہن کو پراکندہ کر دیا ہے، اور نہ صرف یہ کہ اسلام میں یہ مطلب موجود نہیں ہے۔

بلکہ کسی بھی آسمانی برحق دین میں یہ مطلب نہیں پایا جاتا ہے، ہر برحق دین کا نظریہ یہی ہے کہ انسان کی تخلیق اس وجہ سے ہوئی ہے کہ انسان اپنے لئے سعادت یا شقاوت (بدبختی) کو معین کرے، اور انسان کی ہمیشگی سعادت یا ہمیشگی شقاوت اس دنیاوی زندگی کے زیر سایہ حاصل ہوتی ہے، یعنی اگر انسان کی رفتار، گفتار الٰہی قوانین کے تحت ہو تو ہمیشگی سعادت اس کے شامل حال ہوگی، اور اگر انسان کے کارنامے خدا کی مرضی کے خلاف ہوں تو ہمیشگی شقاوت وبدبختی اس کے دامن گیر ہوگی۔

وہ لوگ جن کا نظریہ یہ ہے کہ دین سے ہماری توقعات کم سے کم ہونی چاہئے، انہوں نے انسانی رفتار وگفتار کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہے جس کا ایک حصہ دین سے متعلق ہے اور اس کا دنیا سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور دوسرا حصہ دنیا سے متعلق ہے

وہ دین سے خارج ہے، جیسے سیاسی اور اجتماعی مسائل، البتہ یہ نظریہ صرف ایک مغالطہ اور کج فہمی کا نتیجہ ہے، کیونکہ ان کا خیال یہ ہے کہ اگر دین سے ہماری توقعات حد اکثر ہو تو پھر ہمارے تمام امور دین کے مطابق ہونا ضروری ہیں یہاں تک کہ کھانا پینا مکان بنانا وغیرہ وغیرہ، چونکہ انہوں نے یہ سوچا کہ یہ نظریہ نہ تو صحیح ہے اور نہ ہی دین ان تمام چیزوں کو پورا کرسکتا ہے، لہٰذا یہ لوگ دین سے کم سے کم توقعات کے قائل ہو گئے۔

ان کی یہ غلط فہمی اس وجہ سے ہوئی کہ انہوں نے اس مسئلہ کی صرف دو قسم تصور کی جب کہ تیسری قسم بھی موجود ہے اور یہی تیسری قسم صحیح ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم دین سے اتنی توقع نہیں رکھتے کہ تمام چیزوں کے بارے میں ہمیں بتائے یہاں تک کہ کھانا کھانے، کپڑے پھننے اور مکان بنانے کا طریقہ بتائے، کوئی بھی ایسا دعویٰ نہیں کرتا، اور یہ اس لئے ہے کہ دین نے بہت سے مسائل کے بیان کو سمجھنے کے لئے دنیاوی علوم پر چھوڑ دیا ہے۔

لیکن پھر بھی یہ مسائل کسی نہ کسی اعتبار سے دین سے متعلق ہوتے ہیں، اور یہ اس وقت ہوگا جب یہ مسائل خود ارزش منداور پر اہمیت قرار پائیں۔

یعنی ان کے اندر وہ پہلو بھی کارفرما ہوں جو دین سے متعلق ہیں مثلاً کھانا کھانا دینی مسئلہ نہیں ہے لیکن اگر کوئی مر رہا ہے، بھوکا ہے تو اس کو کھانا کھانا واجب ہے، تو اس صورت میں یہ مسئلہ دینی ہو جائے گا۔

4۔ انسان کے دنیاوی اعمال و کردار کی اہمیت

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری دنیاوی زندگی آخرت کی زندگی سے ایک ربط رکھتی ہے اور ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ انسانی اعمال و کردار اس کے کمال یا پستی کے باعث ہوتے ہیں، اور ہمارا کردار سعادت اخروی میں مؤثر ہوسکتا ہے تو پھر ہمارے یہ افعال و اعمال پر اہمیت اور باارزش ہو جاتے ہیں لہٰذا ہم اب یہ دین کو حق دیتے ہیں کہ وہ ہمارے افعال و کردار کے بارے میں قضاوت کرے یا بہ لفاظ دیگر یہ کہا جائے کہ دین ہمارے حلال و حرام افعال کو بیان کرتا ہو دین ان کو انجام دینے کی کیفیت بیان نہیں کرتا، دین تو یہ کہتا ہے کہ بعض چیزوں کا کھانا حرام اور گناہ ہے۔

مثلاً خنزیر کا گوشت اور نشیلی چیزوں کا کھانا حرام ہے لیکن شراب کیسے بنائی جاتی ہے خنزیر کیسے پالا جاتا ہے یہ دین کا کام نہیں ہے، البتہ اسلام نے خنزیر کے گوشت کو حرام اس لئے کیا ہے کہ دینی عبادات و مسائل میں یہ مانع ہے اور دینی احکام چاہے واجب ہوں یا حرام یہ سب وجوب و حرمت مثبت اور منفی اثرات کی بنا پر جعل ہوئے ہیں یعنی احکام کے متعلقات میں انسان کی سعادت اور آخرت پائی جاتی ہے گویا احکام ایجابی و سلبی کے ذریعہ ہمارے افعال و کردار کی اہمیت پتہ چلتی ہے۔

بہ الفاظ دیگر اس طرح عرض کیا جائے کہ انسان کی ترقی اور تکامل کی راہ ایک نقطہ سے لامتناھی نقطے کی طرف شروع ہوتی ہے اس راہ میں جو چیز ہمارے لئے مفید ہے وہ یہ ہے کہ ہم خدا کی طرف متوجہ ہوں اور انسانی معنویت کی بلندی کا زمینہ ہموار کریں، درجات کے اعتبار سے چاہے وہ احکام واجب ہوں یا مستحب یا اس کے بعد مباح، اور جو راھیں انسان کو تنزل

اور پستی کی طرف لے جانے والی ہیں اور انسان کو راہ کمال اور خداوند عالم سے دور کرتی ہیں "حرام" ہیں اس کے بعد مکروھات ہیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ دین یہ نہیں کہتا کہ کون سا کھانا کھائیں کس طرح کھانا بنائیں کس طرح مکان بنائیں بلکہ دین اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ مکان غصبی جگہ پر نہ بنایا جائے یا مکان کو اس طرح نہ بنائیں کہ جس سے دوسروں کے گھروں کی بے پردگی ہوتی ہو، دین یہ کہتا ہے کہ حلال پیسہ سے مکان بنائیں سود کے پیسہ سے مکان نہ بنائیں، درحقیقت مکان کی اہمیت اور اس کی کیفیت کو بیان کرتا ہے اسی طرح دین یہ کہتا ہے کہ ہمارا کھانا ایسا ہو جس سے ہماری ظاہری اور معنوی رُشد و ترقی ہو اور وہ غذائیں جو حرام ہیں یا "الکحل" نشہ آور چیزوں سے پرہیز کریں جو خود ہمارے لئے ضرر رساں اور نقصان دہ ہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ... [1]

"اے ایمان دارو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے تو بس ناپاک (برے) شیطانی کام ہیں تو تم لوگ اس سے بچے رھس تا کہ تم فلاح پاؤ، شیطان کی تو بس یہی تمنا ہے کہ شراب اور جوے کے بدولت تم میں باہم عداوت و دشمنی ڈلوادے اور خدا کی یاد سے باز رکھے"

نتیجہ یہ نکلا کہ دین کی حلال اور حرام کردہ چیزیں انسانی کردار کو بیان کرنے والی ہیں، یعنی ان کے ذریعہ معلوم ہوجاتا ہے کہ انسانی کردار مثبت پہلو رکھتا ہے یا منفی، اور کیا یہ چیز ہماری سعادت اور کامیابی میں مؤثر ہیں؟ اور کیا یہ چیزیں خدا تک پہنچنے کے لئے راہ ہموار کرتی ہیں؟ یا یہ چیزیں انسان کو بدبختی اور ھلاکت کی وادی میں پہنچادیتی ہیں؟ خلاصہ یہ کہ دین، دنیاوی کردار کے ماورای اس کردار پر توجہ کرتا ہے کہ جس کے ذریعہ انسان جنتی یا جہنمی ہوتا ہے۔

5۔ انسان کے کردار کی اہمیت کو سمجھنے میں عقلی طاقت کی شعائیں

ہمارے افعال و کردار کی اہمیت ایجاب و سلب کے لحاظ سے (یعنی ہمارے افعال و رفتار و کردار کے لئے ارزش کا اثبات کرنا یا سلب کرنا) کبھی اتنا واضح و روشن ہوتا ہے کہ جس کو عقل بخوبی سمجھ لیتی ہے اور شارع مقدس کی طرف سے تعبدی بیان کی ضرورت نہیں بلکہ عقل خود ھی خداوند عالم کے حکم کو مشخص کر لیتی ہے۔

اسی وجہ سے فقہاء کرام مستقلات عقلیہ میں فرماتے ہیں: بعض مسائل میں عقل مستقل طور پر فیصلہ کر لیتی ہے اور افعال و اعمال کے حُسن و قبح (اچھائی، برائی) کو معین کر لیتی ہے اور ہم عقل کے ذریعہ سمجھ لیتے ہیں کہ خداوند عالم کا ارادہ فلاں

[1] سورۂ مائدہ آیت ۹۰، ۹۱

کام کے انجام دینے یا ترک کرنے سے متعلق ہے، ہم عقل کے ذریعہ یہ پتا لگا لیتے ہیں کہ خداوند عالم اس کام سے راضی ہے یا نہیں، ہم سبھی کی عقل اس بات کو سمجھتی ہے کہ کسی یتیم کا مال کھانا برا ہے،

اور اس سلسلے میں شارع مقدس کی طرف تعبدی بیان آنا ضروری نہیں ہے، عقل کی تشخیص کے بعد قرآن وحدیث میں بھی اس بارے میں تعبدی بیان آنا یہ حکم عقل کی تاکید کے لئے ہے، لیکن اکثر مقامات پر ہماری عقل ہمارے افعال واعمال ورفتار وکردار کی اہمیت اور پھر ان افعال کی ہماری شقاوت وسعادت میں تاثیر کی مقدار کو درک کرنے سے قاصر ہے، اس طرح کہ ہم اپنے اعمال کے وجوب وحرمت اور استحباب وکراھت کو عقل کے ذریعہ پہچانیں، لہٰذا ایسے مقامات پر دین کو دخالت کرنے کا حق ہے چنانچہ اس وقت دین کو ہمارے اعمال وافعال کے انجام دینے کے احکام بیان کرنا ھوں گے۔

6۔ دین کی حدود

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ چیزیں جو ہماری ہمیشگی سعادت یا شقاوت میں مؤثر ہیں صرف ان مسائل میں منحصر نہیں جو براہ راست خداوند عالم سے مربوط ہیں، بلکہ دین، عبادی مسائل کے علاوہ دنیاوی امور میں بھی حق دخالت رکھتا ہے اسی وجہ سے دین نے بعض کھانے پینے والی چیزوں کو حلال یا حرام ہونے کو بھی بیان کیا ہے۔

اور جب ہم دینی احکامات کو ملاحظہ کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ دینی حدود انفرادی مسائل میں محدود نہیں ہیں بلکہ اجتماعی مسائل مثلاً گھریلو مسائل، شادی، طلاق اور تجارت وغیرہ جیسے مسائل کو بھی شامل ہیں، اور ان مسائل کا حلال وحرام ہونا ان کی اہمیت کو بیان کرتا ہے، درحقیقت دین ان امور کی حقیقت کو بیان کر کے ان کی حرکت کی جھت وسمت معین کرا ہے اور نشان دھی کر رہا ہے کہ ان کے ذریعہ کس طرح سے خداوند عالم کی سمت انسان حرکت کر سکتا ہے اور کون سے امور شطان کی طرف مایل ہونے کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔

علم بعض چیزوں کے بیان کرنے سے قاصر ہے علم صرف یہ بیان کرتا ہے کہ کس چیز کو بنانے کے لئے کن چیزوں کو کس مقدار میں ہونا ضروری ہے اور فیزیکی اور شیمیائی چیزوں کو بیان کرتا ہے لیکن یہ بیان نہیں کرتا کہ ان چیزوں کو کس طرح استعمال کیا جائے تا کہ انسان حقیقی اور واقعی کمال اور سعادت تک پہنچ سکے، ایسے مقامات پر دین کو قضاوت اور فیصلہ کرنا ہوتا ہے لہٰذا جس طرح ہمارے اعمال ہماری سعادت وبدبختی میں مؤثر ہوتے ہیں اسی طرح سیاسی واجتماعی امور میں ہمارے اعمال ہماری سعادت یا بدبختی میں مؤثر ہوتے ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ اس حصے میں اور زیادہ مؤثر ہوتے ہیں۔

اب رہی ہماری اصل گفتگو یعنی "اجتماعی امور" کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاشرہ اور ملت کا چلانا ہماری سعادت یا بدبختی میں کوئی اثر نہیں رکھتا؟، اور اس معاشرہ کے افراد جس طرح بھی چاہیں معاشرہ کے ادارے کے لئے جس کو چنیں، مختار ہیں اور ان مسائل میں دین کوئی دخالت نہیں رکھتا؟ کون ہے جو نہیں جانتا کہ معاشرہ میں عدالت اور انصاف کی رعایت سے انسان کی سعادت اور کامیابی ہے اور عدالت وانصاف سے کام لینا ایک بہت مہم اور مثبت پہلو رکھتا ہے اس سلسلہ میں اگر کوئی آیت یا

حدیث نہ ہوتی تب بھی ہماری عقل اس بات کو سمجھتی ہے کہ عدالت وانصاف کی رعایت کرنے سے انسانی کمال اور سرفرازی میں شایان شان تاثیر رکھتی ہے، جو حضرات ان مسائل کو سمجھنے کے لئے عقل کو کافی نہیں سمجھتے، وہ قرآن واحادیث کی طرف رجوع کریں، البتہ ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ سیاسی واجتماعی امور کے بہت سے مسائل کی اہمیت کو عقل سے سمجھ سکتے ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو بھی عقل سمجھیں وہ دین کے دائرے سے خارج ہے۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ جو چیز مرضی خدا کو کشف کرتی ہے اور جو چیز خدا کی حکمت اور اس کے ارادہ کو بیان کرتی ہے اور ہم کو آگاہ کرتی ہے کہ خدا کی مرضی کیا ہے اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ اس امر کو کس راستہ کے ذریعہ کشف کریں، بلکہ مہم یہ ہے کہ ہم خداوند عالم کے ارادہ تشریعی کو کشف کریں، چاہے یہ کشف قرآن وسنت کے ذریعہ ہو یا عقل کے ذریعہ، کیونکہ یہ تینوں دلیلیں خدا کے احکام اور دینی قوانین کو کشف کرتی ہیں اسی وجہ سے عقل کو احکام الٰہی کے منابع میں شمار کیا جاتا ہے اور فقہاء کرام نے عقل کو احکام شرعی کے اثبات کرنے والی دلیلوں میں شمار کیا ہے، چنانچہ شرعی مسائل کو ثابت کرنے کے لئے عقل سے بھی تمسک کرتے ہیں، لہٰذا ایسا نہیں ھے کہ عقل اور شرع کے درمیان کوئی حد موجود ہو کہ کچھ چیزیں عقل سے مربوط ہوں اور کچھ چیزیں شرع سے، بلکہ عقل ایسا چراغ ہے کہ جس کی روشنی میں خدا کی مرضی اور اس کے ارادہ کو تلاش کیا جاسکتا ہے، لہٰذا جو چیز اس طرح عقل کے ذریعہ کشف ہوگی وہ دینی ہے۔

7۔ دین اور حکومت میں رابطہ

جو کچھ ہم نے اجتماعی اور سیاسی امور کے بارے میں دین کی دخالت کے سلسلے میں عرض کیا اس پر توجہ رکھتے ہوئے اور مختلف قسم کی حکومتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جواب تک اس دنیا میں وجود پا چکی ہیں خصوصاً وہ حکومتیں جو اسلام کے نام سے یا اسلامی زمانے میں دوسرے ناموں سے جانی جاتی تھیں، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسلام ان کے بارے میں مثبت یا منفی نظریہ نہیں رکھتا؟، اگر ہم معاویہ اور یزید کی فاسد اور ظالم حکومت کا حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی عدالت وانصاف ور حکومت سے مقابلہ کریں تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام ان دونوں حکومتوں کو ایک نگاہ سے دیکھتا ہے اور حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ کی حکومت میں کوئی فرق نہیں ہے؟

کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر انسان آزاد ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق اپنی حکومت کے طریقہ کار کو اپنائے؟! اور اس میں دین کی کوئی دخالت نہ ہو، اور انسانی کردار اور اس کی سعادت یا بدبختی میں کوئی دخالت نہیں رکھتا، یعنی کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ نہ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت انسان کی آخرت میں کوئی تاثیر رکھتی ہے اور نہ ہی معاویہ کا کردار انسان کی آخرت میں کوئی اثر رکھتا ہے؟! کیونکہ حکومت کا طریقہ کار دنیا اور سیاست سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا دین سے کوئی رابطہ نہیں ہے! کیا کوئی عقلمند انسان ان باتوں کو قبول کرسکتا ہے؟ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ دین کی نظر میں یہ دونوں حکومتیں (حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ کی حکومت) مساوی وبرابر ہیں؟ اور دین ان میں سے کسی ایک کی مدح یا مذمت نہیں کرتا؟ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی اور حکومتی جیسے مسائل میں دین کی

دخالت ضروری ہے، دین کو چاہئے کہ حکومت کے لئے مناسب ڈھانچہ پیش کرے، دین کو بیان کرنا چاہئے کہ حاکم وقت اپنی حکومت کے آغاز ہی سے کمزور اور غریب لوگوں کی فکر میں رہے نہ کہ اپنی حکومت کو مضبوط بنانے کے چکر میں لگا رہے؟!

نتیجہ یہ نکلا کہ دین میں بالخصوص دین اسلام میں سیاسی واجتماعی مسائل کی ایک بڑی اہمیت ہے اور ان کو دین کے دائرہ سے خارج نہیں کیا جاسکتا، اور اس بات کا اعتقاد صحیح نہیں کہ ان سیاسی اور اجتماعی مسائل کا انسان کی شقاوت اور سعادت میں نہیں اگر انسان کا آخرت، حساب وکتاب اور ثواب وعذاب پر اعتقاد ہے تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاویہ اور یزید کی حکومت وہ تاثیر نہیں رکھتی! اگرچہ بعض اہل سنت برادران، معاویہ کے مسئلہ کو ابھی تک حل نہیں کر سکے ہیں، لیکن تاریخ میں ایسے بہت سے ظالم وجابر افراد گذرے ہیں جنہوں نے تاریخ کے اوراق کو سیاہ کر کے رکھا ہے، کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان ظالم وجابر لوگوں کی حکومت، عدالت وانصاف ورافراد کی حکومت کے برابر ہیں؟ اسی زمانہ کو لے لیجئے جس میں ہم زندگی گذار رہے ہیں، کیا وہ حکومتیں جو عورتوں اور بچوں کو جن کو ہر مذہب وملت میں بے گناہ مانا جاتا ہے ان کے سروگردن میں جدائی کریں، ان پر بم گرائیں اور ان کو زندہ درگور کریں، ان حکومتوں کے برابر ہوسکتی ہیں کہ جن کی تمام تر کوشش کمزور اور مظلوم لوگوں کی نجات کے لئے ہوتی ہیں؟ کیا یہ دونوں حکومتیں جنت میں جاسکتی ہیں؟ لہٰذا کس طرح سیاسی واجتماعی مسائل کو دین سے خارج مانا جاسکتا ہے؟ اگر یہ طے ہے کہ دین اسلام حلال وحرام، ثواب وعذاب اور دوسرے دینی مسائل میں اپنی خاص نظر رکھتا ہو تو بدرجہ اولیٰ سیاسی واجتماعی مسائل وہ واضح وروشن مسائل ہیں کہ جن میں دین کا نظریہ ضروری ہے۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ وہ نظریہ جس میں دینی مسائل کو دنیاوی مسائل سے الگ کیا جاتا ہے اور دینی مسائل کو صرف خدا اور آخرت سے مخصوص کیا جاتا ہے، اور ان کو دنیاوی دائرہ سے خارج مانا جاتا ہے (یعنی انسان کے بعض امور، دانشمندوں اور سیاسی لوگوں پر چھوڑ دیئے گئے ہیں اور بعض امور، دینی علماء کرام پر چھوڑ دیئے گئے ہیں) یہ نظریہ بالکل غلط اور باطل ہے اور کسی بھی طریقہ سے اسلامی نظریہ سے سازگار اور موافق نہیں ہے، اسلام انسان کیلئے جس زندگی کے بارے میں نظریہ رکھتا ہے اور اسلام جس طرز زندگی کو پیش کرتا ہے اور ہمیں اس کی طرف دعوت دیتا ہے اس (گذشتہ) نظریہ سے ہم آہنگ وموافق نہیں ہے۔

چھوڑئے ان لوگوں کو جو اس طرح کا نظریہ رکھتے ہیں یہ لوگ نہ خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں اور نہ ہی قیامت پر، ان کی یہ باتیں صرف اور صرف اس وجہ سے ہوتی ہیں تاکہ علماء دین کو اس میدان سے باہر نکال دیں، لیکن ہم کو ان کے ذاتی عقیدہ سے کوئی مطلب نہیں ہماری عرض تو صرف یہ ہے کہ دنیاوی مسائل کو دینی مسائل سے جدا کرنے کا نظریہ اور دنیاوی مسائل کو دینی حدود سے خارج کرنے کا نتیجہ اسلام کے انکار کا سبب بنتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا نتیجہ نہیں رکھتا، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ انسان کا کوئی بھی عمل ایسا نہیں ہے جو ہماری سعادت یا بدبختی میں موثر نہ ہو، لہٰذا ہمیں قبول کرنا پڑے گا کہ ہماری تمام زندگی میں دین اپنا نظریہ دے سکتا ہے اور اس کی اہمیت کو بیان کرسکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

"مَا مِنْ شَیْءٍ یُقَرِّبُکُمْ اِلَی الْجَنَّةِ وَیُبَاعِدُکُمْ عَنِ النَّارِ اِلَّا وَ قَدْ اَمَرْتُکُمْ بِهٖ وَ مَا مِنْ شَیْءٍ یُقَرِّبُکُمْ مِنَ النَّارِ وَ یُبَاعِدُکُمْ مِنَ الْجَنَّةِ اِلَّا وَ قَدْ نَهَیْتُکُمْ عَنْهُ"۔ [1]

"نہیں ہے کوئی ایسی چیز کہ جو تمہیں جنت سے قریب کرے اور جہنم سے دور کرے مگر یہ کہ میں نے تم کو اس کے کرنے کا حکم دیا ہے اور نہیں ہے کوئی ایسی چیز کہ جو تمہیں جہنم سے قریب اور جنت سے دور کرے مگر یہ کہ میں نے تم کو اس سے منع کیا ہے"

اسلامی نظریہ کے مطابق سعادت کے معنی جنتی ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں اور بدبختی کے معنی جہنمی ہونے کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہے:

فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ ــــــ

وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ۔ [2]

"تو جو لوگ بدبخت ہیں وہ دوزخ میں ہوں گے اور جو لوگ نیک بخت ہیں وہ تو بہشت میں ہوں گے"

8۔ دین کی جامعیت

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق ایک دوسرا نظریہ بھی باطل ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہا گر کوئی یہ کہے: ٹھیک ہے کہ دین حلال وحرام کو بیان کرسکتا ہے لیکن زندگی کے بعض امور کو خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان کر دیا ہے اور بعض دوسرے امور کو لوگوں پر چھوڑ دیا ہے بعض وہ چیزیں جو آنحضرت کے زمانے سے متعلق تھیں وہ بیان کر دیں اور باقی چیزوں کو ہم لوگوں پر چھوڑ دیا تا کہ زمان ومکان کے لحاظ سے ہم خود طے کرلیں کہ کون چیزیں حلال ہیں اور کون چیزیں حرام۔

کیونکہ اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سعادت تک پہنچنے والی تمام چیزوں کو بیان نہیں فرمایا جبکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں ہے کوئی ایسی چیز کہ جس کے ذریعہ تمہاری سعادت کی ضامن ہو مگر یہ کہ میں نے اس کو بیان کر دیا، البتہ آنحضرت کے فرمان کے یہ معنی نہیں کہ آپ نے تمام چیزوں کی جزئیات بھی بیان کر دیں، بلکہ آپ نے کلّی چیزوں کو بیان کیا ہے تا کہ آئندہ زمانے میں ائمہؑ اور مجتہدین جو ایسی صلاحیت رکھتے ہیں کہ جزئی احکام، اور حلال وحرام کو کلی عناوین پر منطبق اور مرتب کر کے ان کے احکام کو معلوم کرلیں، اور ان کو عناوین اولیہ یا عناوین ثانویہ یا حکومتی احکام کے عنوان سے لوگوں کے سامنے پیش کریں، بے شک مصادیق کی تشخیص اور جزئی احکام، انہیں کلی احکام پر منطبق ہیں کہ جو قرآن، سنت اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی احادیث میں ذکر ہوئے ہیں جن کو اصطلاحاً فتویٰ کہا جاتا ہے۔

---

[1] بحار الانوار ج ۷۰ ص ۹۱

[2] سورہ ہود آیت ۱۰۶، ۱۰۸

پانچویں نشست

اسلام میں آزادی

(پہلا حصہ)

1۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

ہم نے اسلام میں سیاست کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے عرض کیا کہ حکومتی اور سیاسی مسائل، معرف اسلامی کا ایک حصہ ہیں اس سے قبل ہم نے اشارہ کیا کہ بعض لوگوں نے جامعہ میں انحراف اور کج روی پیدا کرنے کے لئے نیز لوگوں کے ذھنوں کو پراکندہ کرنے کے لئے اسلامی حکومت کے سلسلہ میں بہت سے اعتراضات کیئے ہیں جن میں سے ایک شبہ یہ تھا کہ دین کا دائرہ دنیا کے دائیرہ سے جدا ہے اور دین دنیاوی مسائل میں کوئی مداخلت نہیں کرتا اور یہ کہ دنیاوی امور میں دخالت کرنا دین کے شایان شان نہیں ہے دین کا کام صرف ان امور سے وابستہ ہے جو آخرت اور منویات سے مربوط ہیں اور انسان کا خدا سے رابطہ کا نام دین ہے، خلاصہ یہ کہ دین سے کم سے کم امید رکھیں اس سے پہلے جلسہ میں ہم نے اس اعتراض کا جواب عرض کیا اور ہم نے "دین سے ہماری امیدیں" کی بحث کے سلسلہ میں اس مغالطہ (کہ دین سے ہماری امیدیں زیادہ ہوں یا کم سے کم) کا جواب مفصل طور پر عرض کیا تھا۔

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی اور اس سے متعلق دوسری واقفیتوں کے دورخ ہیں: پہلا رخ یہ ہے کہ سببی اور مسببی علت اور معلول رابط موجود ہے جیسا کہ یہ رابطہ تمام چیزوں میں بھی پایا جاتا ہے، مثلا کون کون سی چیزیں آپس میں مرکب ہوں تا کہ فلاں شیمیائی چیز وجود میں آسکے، اور ایک زندہ چیز کن شرائط کے ساتھ رشد ونمو کرتی ہے، یہ انسان جو ایک زندہ چیز ہے کس طرح زندگی کرتا ہے اور کس طرح اپنی صحت وسلامتی کو محفوظ کرتا ہے، اور جب مریض ہوجائے تو کس طرح اپنا علاج کرائے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ اس دنیا کی تمام حقیقوں کا انسان کی روح اور معنوی کمالات سے رابطہ ہے۔

2۔ علم اور دین کے مخصوص دائرے

الکحل کو کس طرح اور کن چیزوں کے ذریعہ بنایا جاتا ہے اور الکحل کتنے طریقوں کا ہوتا ہے یہ ایک علم ہے اور ایسی چیزوں کی تحقیق اور بررسی کرنا دین کی ذمہ داری نہیں ہے دین کی ذمہ داری یہ ہے کہ بیان کرے کہ الکحل کو پیا جائے یا نہیں؟ اور اس کا انسان کی روح اور معنوی پہلو کے لئے نقصان دہ ہے یا نہیں دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ دین کی ذمہ داری یہ ہے کہ بیان کرنا ہے کہ الکحل کا استعمال کرنا حلال ہے یا حرام؟ اس طرح دین دوسری چیزوں کے احکام کو بیان کرتا ہے، نہ کہ

اس علمی اور تحقیقی پہلو کو بیان کرتا ہے دین ان چیزوں کی ترکیبات سے بحث نہیں کرتا بلکہ وہ تو ان چیزوں اور انسانی روح اور اس کی صلاح و اچھائی کے رابطہ کو بیان کرتا ہے اور ان کی تحقیق و بررسی کرتا ہے، کس کارخانہ یا تجارتی گروپ کا منیجر کس طرح صحیح طور پر کام کرسکتا ہے اور کس طرح کے پروگرام بنائے جائیں تا کہ اچھے نتائج برآمد ہوسکیں ان سوالوں کا جواب علم دے سکتا ہے لیکن ان کارخانوں میں کیا چیز بنائی جائے اور کون سی چیز بنانا جائز ہے اور کون سی چیز حرام ہے اور کون سی چیز انسانی روح سے مربوط ہے یہ دین کا کام ہے۔

3۔ دینی حاکمیت کا آزادی سے ٹکراؤ، ایک شبہ

لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے ایک شبہ جو مختلف طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے البتہ یہ شبہ صرف ایک مغالطہ ہے، وہ شبہ یہ ہے کہ اگر دین انسان کے سیاسی اور اجتماعی کاموں میں مداخلت کرے اور لوگوں کو کسی خاص طریقہ کو اپنانے پر زور دے یا کسی کی اطاعت کا حکم دے تو یہ انسان کی آزادی کے خلاف ہے اور انسان چونکہ آزاد اور صاحب اختیار ہے کہ جو چاہے کرے جو چاہے نہ کرے، اور اس کو کسی کام پر مجبور کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے، اور چونکہ دین انسان کے لئے تکلیف معین کرتا ہے، اور اس کو کسی کی اطاعت کا حکم کرتا ہے اطاعت بھی اطاعت مطلق (یعنی چون و چرا) یہ سب کچھ آزادی سے میل نہیں کھاتا۔

4۔ مذکورہ شبہ دینی انداز میں

مذکورہ شبہ کو مختلف شکلوں میں بیان کیا جاتا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ شبہ کرنے والا اپنی دینداری کا ڈنکا بجاتا ہے اور خود کو قرآن کا ماننے والا کہتا ہے اور اپنے شبہ کو مومنین اور متدین افراد پر کارگر کرنے کے لئے اس کو قرآنی اور دینی محمل سے سجاتا ہے اور کہتا ہے کہ اسلام، انسان کی آزادی کا خاطر خواہ احترام کرتا ہے اور قرآن کریم دوسروں کے تسلط اور حکومت کی نفی کرتا ہے یہاں تک کہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی پر تسلط (حق حکومت) نہیں رکھتے تھے، اور کسی کو مجبور نہیں کیا گیا لہٰذا قرآن کے نظریہ کے مطابق انسان آزاد ہے اور کسی کی اطاعت پر مجبور نہیں ہے۔

ان تمام شبہات اور مغالطوں کا مقصد، ولایت فقیہ کے اصولوں کو ضعیف اور کمزور کرنا ہے، اسی مقصد کے لئے یہ شبہ ایجاد کیا گیا ہے تا کہ ولایت فقیہ کی اطاعت کو انسانی آزادی کے خلاف قرار دیا جاسکے، اور یہ اسلامی نظریہ کے سراسر مخالف ہے کیونکہ انسان اشرف المخلوقات اور زمین پر خدا کا خلیفہ ہے، ذیل میں ان آیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کو شبہ کرنے والوں نے اپنا مدرک بنایا ہے

(1) خداوند عالم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب فرمارہا ہے:

فَذَكِّرْ ۖ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾ ۔ [1]

"تم تو بس نصیحت کرنے والے ہو، تم کچھ ان پر داروغہ تو ہو نہیں"

اس آیت کے پیش نظر، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے بلند و بالا مقام رکھتے ہیں جب وہ تسلط نہیں رکھتے اور مسلمان آزاد ہیں ان پر پیغمبر کی اطاعت کرنا لازم نہیں ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگوں کی زندگی کے بارے میں اظہار خیال کرنے کا حق بالکل نہیں ہے۔

2۔ وَمَا جَعَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍ۔ [2]

"اور ہم نے تم کو لوگوں کا نگہبان تو بنایا نہیں ہے اور نہ تم ان کے ذمہ دار ہو"

3۔ مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ۔ [3]

"(ہمارے) رسول پر پیغام پہنچا دینے کے سوا (اور) کچھ (فرض) نہیں"

4۔ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا۔ [4]

"اور ہم نے (انسان) کو راستہ بھی دکھا دیا (اب وہ) خواہ شکر گذار ہو خواہ ناشکرا"

5۔ وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ۔ [5]

"(اے رسول) تم کہہ دو کہ سچی بات (کلمہ توحید) تمہارے پروردگار کی طرف سے (نازل ہو چکی ہے) بس جو چاہے مانے اور جو چاہے نہ مانے"

مذکورہ اعتراض کا جواب

اس اعتراض کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ معترض نے جن آیات کے ذریعہ رسول خدا کے تسلط نہ ہونے اور آنحضرت کی اطاعت کو واجب نہ ہونے پر تمسک کیا ہے، ان کے مقابلے میں دوسری ایسی آیات موجود ہیں جو خود معترض کی غلط اور غیر صحیح برداشت کے منافی ہیں ذیل میں ہم ان آیات کو بیان کرتے ہیں:

1۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ۔ [6]

---

[1] سورہ غاشیہ آیت ۲۱، ۲۲

[2] سورہ انعام آیت ۱۰۷

[3] سورہ مائدہ آیت ۹۹

[4] سورہ انسان آیت ۳

[5] سورہ کہف آیت ۲۹

[6] سورہ احزاب آیت ۳۶

"اور نہ کسی ایماندار مرد کو یہ مناسب ہے اور نہ کسی ایماندار عورت کو کہ جب خدا اور اس کے رسول کسی کام کا حکم دیں تو ان کے اپنے اس کام (کے کرنے نہ کرنے) کا اختیار ہو"

مذکورہ آیت واضح طور پر خدا و رسول کی اطاعت کو لازم اور ضروری ہونے کو بیان کر رہی ہے کہ مومنین کو رسول خدا کی اطاعت سے سرپیچی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

2۔ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۝۵۵۔ [1]

"(اے ایماندارو) تمہارے مالک سرپرست تو بس یہی ہیں خدا اور اس کا رسول اور وہ مومنین جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں"

3۔ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔ [2]

"نبی تو مومنین سے خود ان کی جانوں سے بھی بڑھ کر حق رکھتے ہیں"

دونوں صورتوں میں لوگوں کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے خود اپنے بارے میں ان کی رائے پر مقدم ہے اس آیت کے سلسلہ میں تمام مفسرین قرآن اس بات پر متفق ہیں، لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ پیغمبر کی رائے کو اپنی رائے پر مقدم رکھیں اور پیغمبر کی رائے کی مخالفت کرنے کا حق نہیں رکھتے، البتہ مذکورہ آیت رسول خدا کی اصل ولایت کو بیان کر رہی ہے، اور یہ بیان نہیں کر رہی ہے کہ آنحضرت کی ولایت کہاں تک محدود ہے، اور آنحضرت کی ولایت اور آپ کی رائے کا مقدم ہونا صرف احتمالی امور میں ہے یا اجتماعی امور کے علاوہ مشخص امور کو بھی شامل ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ شبہ کرنے والے نے جن آیات سے تمسک کیا کہ رسول اور ان کے جانشینوں کی اطاعت کی نفی کی گئی ہے ان دو طرح کی آیات کے تناقض (ٹکراؤ) کا جواب بھی دے ہوسکتا ہے کہ معترض ان آیات سے بالکل غافل ہو، یا ان آیات کے مطلب کو قبول ہی نہ کرتا ہو لیکن چونکہ ہم قرآن کریم کی آیات میں تناقض اور تعارض کے منکر ہیں لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ان آیات کے ظاہری تناقض کو حل کریں اس اہم امر کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان دو طرح کی آیات کو پہلی اور بعد کی آیتوں نیز آیات کے لحن (طرز) اور ان کے مخاطبین کو ملاحظہ کریں تا کہ آیات کے حقیقی مطلب کو سمجھ سکیں۔

5۔ قرآن پر مختلف توجہ کی دلیل

جس وقت ہم آیات کے پہلے اور دوسرے گروہ پر دقت کرتے ہیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آیات کا لحن ایک دوسرے سے مختلف ہے: آیات کا پہلا گروہ ان لوگوں کے بارے میں تھے کہ جنھوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا ہے اسی وجہ سے

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۵۵

[2] سورہ احزاب آیت ۶

خداوند عالم ان لوگوں کو حقیقت اسلام کی رہنمائی کرتا ہے اور اپنی اطاعت کے فوائد کو بیان کرتا ہے اور جب اپنے پیغمبر جو خدا کی رحمت و مہربانی کے مظہر ہیں مگر بعض لوگوں کے اسلام کو قبول نہ کرنے اور خدا کی اطاعت سے روگردانی کرنے کی وجہ سے پریشان دیکھتا ہے کہ جس کے نتیجہ میں یہ لوگ دوزخ کے راستہ کو اپنے لئے ہموار کرتے ہیں ایسے موقع پر خداوند عالم اپنے رسول کو نگران و پریشان دیکھ کر ان کی دلجوئی کرتا ہے کہ اے میرے حبیب ان لوگوں کے ایمان نہ لانے سے کیوں غمگین ہوتے ہیں اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے ہیں ہم نے اسلام کو اس لئے نازل کیا تا کہ لوگ اپنی مرضی اور اپنے اختیار سے اسے قبول کریں وگرنہ اگر ہم چاہتے تو تمام لوگوں کی ہدایت کر دیتے اور اس کی قدرت بھی ہم میں ہے:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۹۹ [1]

"(اے پیغمبر) اگر آپ کا پروردگار چاہتا ہے تو جتنے لوگ روئے زمین پر ہیں سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو تا کہ سب کے سب ایماندار ہو جائیں"

خداوند عالم کا انبیاء کو بھیجنے کا ہدف یہ ہے کہ لوگ حق کو پہچانتے ہوئے اپنے لئے سعادت کا راستہ اپنائیں اور اپنے اختیار سے دین حق کو قبول کریں نہ یہ کہ خداوند عالم ان کو ایمان لانے پر مجبور کرے وہ ایمان جو اکراہ اور اجبار سے حاصل ہو اس کی کوئی قیمت نہیں ہے اور ہمارے پیغام کو پہنچانا تھا لہٰذا آپ ان مشرکین کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے پریشان نہ ہوں، کیا آپ سوچتے ہیں کہ آپ نے اپنی رسالت کی ذمہ داری پر عمل نہیں کیا، آپ کی رسالت یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو خوف اور اکراہ کے ذریعہ مسلمان کریں، کیونکہ ہم نے آپ کو کفار پر مسلط نہیں کیا ہے تا کہ طاقت کے زور پر ان کو مسلمان کر سکیں آیات کے پہلے گروہ کے مقابلے میں آیات کا دوسرا گروہ ان لوگوں کے بارے میں ہیں کہ جنہوں نے معرفت و شناخت کے ساتھ اپنے اختیار سے اسلام کو قبول کیا ہے ان آیات میں ان افراد کو پیغام دیا جا رہا ہے کہ اسلامی احکامات پر عمل کریں اور اس پیغمبر کی اطاعت کریں کہ جس کے بارے میں اعتماد رکھتے ہیں کہ یہ پیغمبر اور اس کے تمام احکامات خدا کی طرف سے ہیں اور اس پیغمبر کی رائے کے سامنے سر تسلیم خم کریں اور آنحضرت کے فرمان پر حق انتخاب بھی نہیں رکھتے۔

اسلام قبول کرنے سے پہلے انسان کو حق انتخاب ہے لیکن اسلام کو قبول کرنے کے بعد تمام شرعی احکامات کو تسلیم کرنا ہوگا اس بنا پر وہ لوگ جو خدا کے بعض احکام پر ایمان رکھتے ہیں خداوند عالم ان کی سخت مذمت کرتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝۱۵۰ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ [2]

---

[1] سورہ یونس آیت ۹۹

[2] سورہ نساء آیت ۱۵۰، ۱۵۱

"بے شک جو لوگ خدا اور اس کے رسولوں سے انکار کرتے ہیں اور خدا اور اس کے رسولوں میں تفرقہ ڈالنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض (پیغمبروں) پر ایمان لائے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس (کفر و ایمان) کے درمیان ایک دوسری راہ نکالیں یہی لوگ حقیقتاً کافر ہیں"

بعض احکام کو قبول کرنا اور دوسرے احکام قبول نہ کرنا اسی طرح بعض قوانین کو قبول کرنا اور دوسرے قوانین سے سرپیچی کرنا گویا اصل دین کا انکار کرنا ہے، کیونکہ اگر دین کو قبول کرنے کا معیار اور میزان خداوند عالم کے احکامات ہوں تو احکامات الٰہی کے حساب سے عمل کیا جائے اور خدا کے احکامات تمام احکام وقوانین کو قبول کرنے کے لئے ہیں یہاں تک کہ اگر دین قبول کرنے کا معیار مصالح اور مفاسد ہوں کہ جن کو خدا جانتا ہے، اور اپنے احکامات میں ان کو ملاحظہ کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ خداوند عالم تمام مصالح ومفاسد کو جانتا ہے، لہٰذا پھر کیوں بعض احکام کو قبول کیا جائے نتیجہ یہ نکلا کہ وہ شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے جو پیغمبر کا بھی معتقد ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قضاوت اور ان کے فرمان کو قبول کرے اور دل سے بھی اس پر راضی رہے حتی ناراحتی کا احساس بھی نہ کرے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا [1]

"پس (اے رسول) تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ سچے مومن نہ ہوں گے تاوقتیکہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم (نہ) بنائیں پھر (یہی نہیں بلکہ) جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے کسی طرح دل تنگ بھی نہ ہوں بلکہ خوش خوش اس کو مان لیں"

حقیقی مومن، رسول خدا کی قضاوت اور فیصلہ کو دل سے قبول کرتا ہے اور ناراحتی کا احساس نہیں کرتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو پورا یقین ہے کہ یہ رسول خدا کا بھیجا ہوا ہے ان کا حکم خدا کا حکم ہے یہ رسول اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا

إِنَّآ أَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ أَرٰىكَ اللّٰهُ [2]

(اے رسول) ہم نے تم پر برحق کتاب اس لئے نازل کی ہے کہ جس طرح خدا نے تمہاری ہدایت کی ہے اسی طرح لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو"

اگر کوئی اسلام کو قبول کرنے کے بعد کہے، میں اسلامی احکام میں عمل کرنے سے آزاد ہوں اگر چاہوں عمل کروں اگر چاہوں عمل نہ کروں یہ اس حکومت کی طرح ہے کہ جو ڈیموکراسک اور آزاد ہے وہ لوگ اپنی مرضی سے اس حکومت کے انتخاب میں شرکت کرتے ہیں اور اپنے ووٹوں کے ذریعہ وزیر اعظم، رئیس جمہور اور ممبر آف پارلیمینٹ کو منتخب کرتے ہیں لیکن جب

---

[1] سورہ نساء آیت ۶۵

[2] سورہ نساء آیت ۱۰۵

یہی حکومت کوئی قانون بناتی ہے تو اس پر عمل کرنے سے.....؟

اور جب یہ حکومت ٹیکس لگاتی ہے تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ میں نہیں دونگا اصل حکومت اور اس کے ووٹ دینے میں آزاد تھے لہٰذا اب بھی آزاد ہیں کہ اس کے قانون پر عمل کریں یا عمل نہ کریں ان باتوں کو کوئی بھی عقلمند قبول نہیں کرسکتا۔

جی ہاں: اسلام کو قبول کرنے میں کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اسلام دلی اعتقاد کا نام ہے اور طاقت کے زور پر کسی نے اسلام قبول کرلیا تو اس وقت اس سے کہا جائے گا نماز پڑھو اور اگر کوئی کہے کہ میں نماز نہیں پڑھوں گا یا اگر اس سے کہا جائے کہ زکاۃ دو لیکن زکاۃ دینے سے انکار کرے، اے ک تو کوئی بھی انسان اس کو قبول نہیں کرسکتا کیونکہ اگر کسی نے اسلام قبول کرلیا تو اس کے تمام احکام کو بھی قبول کرنا پڑے گا یہ نہیں ہوسکتا کہ اسلام تو قبول کرلے لیکن اس کے احکامات کو قبول نہ کرے، اور اپنی مرضی کے مطابق اعمال انجام دے کوئی بھی حکومت اس بات کو قبول نہیں کرسکتی کہ انسان اس کو ووٹ دے لیکن عملی میدان میں اس حکومت کے قوانین کو قبول نہ کرے، اجتماعی زندگی میں بنیادی ترین اصل وظائف اور تعہد و پیمان اور وعدہ پر وفادار نہ ہو تو اجتماعی زندگی بالکل ہی وجود نہیں پاسکتی۔

لہٰذا اگر کوئی یہ کہے کہ میں اسلام کو قبول کرتا ہوں اور پیغمبر پر ایمان رکھتا ہوں لیکن اسلام مے احکامات پر عمل نہیں کرتا اور اس کی حاکمیت اور ولایت کو قبول نہیں کرتا تو ایسے اسلام کا کوئی فائدہ نہیں ہے، کیونکہ اسلام اور پیغمبر کو قبول کرنا اور اطاعت و پیروی نہ کرنے میں ظاہری تناقض پوشیدہ ہے۔

ہماری گفتگو سے یہ واضح و روشن ہو چکا ہے کہ اگر کوئی انصاف کی آنکہ سے آیات کو ملاحظہ کرے اور ان کی دلالت، لحن اور ماقبل و مابعد کو غور سے دیکھے تو قرآن کریم میں کوئی تناقض نہیں ملے گا اور مذکورہ شبہ کی اطاعت اور آزادی میں جو تناقض ہے وہ بالکل ختم ہوجائے گا جیسا کہ قرآن مجید نے بھی اسی کو صحیح کہا ہے)

لیکن جن کے دل مریض ہیں وہ قرآن کریم کو صداقت اور انصاف سے نہیں دیکھتے اگر یہ لوگ قرآن کا مطالعہ کرتے تو اس وجہ سے کہ اپنی کج فکری اور منحرف نظریات کی دلائل تلاش کریں، اور اس وجہ سے کہ قرآن کی آیات کے بعض حصوں کو انتخاب کرتے ہیں اور سیاق و سباق (پہلی اور بعد والی آیتوں کو) نہیں دیکھتے اور قرآن کے مطابق محکمات قرآن کو چھوڑ دیتے ہیں اور متشابہات کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ [1]

"پس جن لوگوں کے دل میں کجی ہے وہ انہیں آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جو متشابہ ہیں تاکہ فساد برپا کریں اور اس خیال سے کہ انہیں اپنے مطلب پر ڈھال لیں حالانکہ خدا اور ان لوگوں کے سوا جو علم میں بڑے پایہ پر فائز ہیں ان کا

---

[1] سورہ آل عمران آیت ۷

اصلی مطلب کوئی نہیں جانتا"

متشابہات کی پیروی کے علاوہ آیات کوٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں اور آیت کے ایک جملہ کو اخذ کرتے ہیں اور ماقبل و مابعد کو چھوڑ دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں ان کو قرآن مجید میں تناقض نظر آتا ہے جیسا کہ مذکورہ شبہ میں ان لوگوں نے آیات کے ما قبل و مابعد کو چھوڑتے ہوئے اعتراض کیا کہ پیغمبروں کی ولایت آزادی کے مخالف ہے۔

وہ آیات کہ جن میں رسول اسلام کے تسلط کا انکار کیا گیا ہے وہ کفار کے اسلام قبول کرنے سے پہلے نازل ہوئی تھیں جن میں کہا گیا ہے کہ رسول ان کو طاقت کے زورں پر اسلام قبول نہ کروائیں یعنی آنحضرت کفار پر تسلط نہیں رکھتے، درحقیقت ان آیات کے مطابق احکام الٰہی میں عمل کی آزادی اسلام لانے سے پہلے ہے ورنہ تو اسلام قبول کرنے والے ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ پیغمبر اور دوسرے اسلامی احکام کی پیروی کریں اور اس کا وظیفہ ہے کہ تمام اسلامی احکامات کی رعایت کریں، اسلامی اور الٰہی قوانین کی توہین نیز دین کی توہین یا تجاہر بہ فسق (کھلے عام گناہوں کا مرتکب ہونا) کرنے والوں کا شدت سے مقابلہ کرتی ہے یہ درحقیقت جامعہ پر اسلامی حکام کی ولایت ہی تو ہے کہ جو ان کو موظف کرتی ہے کہ ایمان اور اسلام کے تمام لوازمات پر مؤید ہیں وہ اسلام ہے جو خود انہوں نے اپنی مرضی سے قبول کیا ہے۔

6۔ مذکورہ شبہ غیر مذہبی طریقہ سے

اب تک اس شبہ کے جواب میں بحث کی گئی ہے جو قرآنی اور دینی لہجہ میں تھا، اور یہ شبہ اس شخص کی زبان سے تھا جو خود مسلمان اور دیندار کھلاتا ہے، اور آیات قران کو دلیل بناتا ہوا یہ نتیجہ اخذ کرتا تھا کہ اسلام کو الزام آور فرمان نہیں دینا چاہئے، یعنی اسلام کو لوگوں کی زندگی میں دخالت نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ دخالت خود اسلام کی قبول کردہ آزادی کے خلاف ہے۔

اس وقت اس اعتراض کے بارے میں بحث کرتے ہیں کہ جو غیر مذہبی طور پر کیا جاتا ہے، اس اعتراض میں شبہ کرنے والے کی یہ فکر ہے کہ اسلام کے الزام آور احکام اور اس کی اطاعت و پیروی کو جوہر انسانیت سے ناسازگار اور منافی قرار دے، اگرچہ یہ شبہ چند طریقوں سے کیا گیا ہے، ہم یہاں پر بعض طریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

منطق کی اصطلاح میں "اختیار" انسان کی فصل اور مقوم ہے اور اسی سے جوہر انسانیت کی وجود پاتا ہے، لہٰذا اگر ہم انسان سے اختیار اور اس کی آزادی کو سلب کرلیں اور اس کو مجبور کریں تو گویا ہم اس سے انسانیت کو سلب کررہے ہیں اور گویا اس کو ایک حیوان کی مانند قرار دے رہے ہیں، اور اس کی گردن میں لگام ڈال کر ادھر اُدھر کھینچ رہے ہیں، لہٰذا انسان کی اہمیت اس چیز کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کو "حق انتخاب" دیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین اس کے لئے الزام آور احکام بیان نہ کرے، اور اگر اس کو پیغمبر، ائمہ اور نائبین ائمہ کی اطاعت کے لئے مجبور کرے، تو اس صورت میں انسانیت کا احترام اور اس کی اہمیت ختم ہوجاتی ہے اور گویا ہم اس کو حیوان کی طرح قرار دے کر ادھر اُدھر لے جارہے ہیں۔

7۔ "ھیوم" کے اعتراضات اور ان کے جوابات

اول: ہم مذکورہ اعتراض کے دو جواب پیش کریں گے اور چونکہ معترض کا اعتراض ھیوم کے اعتراض کی طرح ہے، ھیوم کا اعتراض یہ ہے کہ عقل نظری "است ھا" (ہے) کو درک کرتی ہے اور عقل عملی "باید ھا و نباید ھا" (فلاں چیز ہونی چاہئے اور فلاں چیز نہیں ہونی چاہئے) کو درک کرتی ہے اور چونکہ عقل نظری کا، عقل عملی سے کوئی ربط نہیں ہے لہٰذا عقل عملی کی درک شدہ چیزوں (باید ھا و نباید ھا) کو عقل نظری کی بنیاد قرار نہیں دی جاسکتی۔

ھیوم کا اعتراض مغربی فلاسفہ کی قابل توجہ قرار پایا اور انہوں نے اس کو بہت سی علمی چیزوں کی بنیاد قرار دیا، جمہوری اسلامی ایران کے انقلاب کے بعد بہت سے مغربی دانشمندوں نے یہ اعتراض کیا کہ ہم "است ھا" سے "باید ھا" کا نتیجہ نہیں نکال سکتے مثلاً اگر کوئی شخص ایک خاص صفت رکھتا ہے تو اسکا نتیجہ یہ نہیں لیا جاسکتا ہے کہ اس طرح ہونا چاہئے یا نہ ہونا چاہئے، کیونکہ "است ھا" کی درک کرنے والی عقل نظری ہے اور "باید ھا" کو درک کرنے والی عقل عملی ہے، جبکہ ان دونوں میں کوئی ربط نہیں ہے۔

ھیوم کے اس اعتراض کو ماننے والے یہ کہتے ہیں: لوگوں کو کسی کام پر مجبور کرنا ان کی انسانیت کے خلاف ہے، لہٰذا دین کو الزام آور احکامات پیش نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ انسان مختار اور آزاد ہے، پہلے یہ کہتے ہیں کہ انسان مختار ہے لہٰذا اس کو آزاد رہنا چاہئے، اور اس کو مجبور نہیں کیا جانا چاہئے اس بنا پر انسان کے مختار ہونے سے کہ جو "است ھا" میں سے ہے اور جس کو عقل نظری درک کرتی ہے "باید و نباید" کہ جس کو عقل عملی درک کرتی ہے کا نتیجہ لیتے ہیں اور ان کی بنیاد یہی تناقض ہے کہ جس کو وہ خود قبول کرتے ہیں کہ "است ھا" کے ذریع "باید ھا" کا نتیجہ نکلے۔

البتہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اگر ''است ھا'' کسی چیز کی علت تامہ ہو تو اس وقت اس کا نتیجہ ''باید ھا'' لیا جاسکتا ہے لیکن یہ نتیجہ ہماری بحث میں نہیں لیا جاسکتا، کیونکہ انسان کا مختار ہونا، اس کے مکلف ہونے کی علت تامہ نہیں ہے، بلکہ اختیار تکلیف کے لئے راہ ہموار کرتا ہے، اور کسی کام پر تکلیف اور اس پر مجبور کرنا یا کسی کام سے روکنا کسی خاص مصلحت یا مفسدہ کی وجہ سے ہوتا ہے جس کے ضمن میں کام ہوتا ہی ہے، لہٰذا کسی کام پر مجبور کرنے میں اس کی مصلحت چھپی ہوتی ہے اور کسی کام سے روکنے میں اس کا ضرر اور نقصان پوشیدہ ھتا ہے۔

8۔ دوسرا جواب: آزادی مطلق اور لامحدود نہیں ہے

اگر ہم اس شبہ کو مان بھی لیں اور کہیں کہ چونکہ انسان مختار ہے لہٰذا اس کو کسی کام پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اور کوئی بھی حکومت انسان کے لئے الزامی احکام نافذ نہیں کرسکتی کیوں کہ انسان آزاد ہے جس طرح چاہے عمل کرے اور آزادی کا سلب کرنا ہے اور آزادی کا سلب کرنا یا انسانیت کا سلب کرنا لہٰذا کوئی بھی قانون قابل اعتبار نہیں ہے اور جنگلی راج اور عسر و حرج کو قبول کرلیں۔

لیکن ہم یہ عرض کریں گے کہ کس چیز کے الزام اجبار ہی کے ذریعہ قانون قانون ہوسکتا ہے قانون اس وقت قانون ہوگا کہ جب اپنے ہمراہ الزام واجبار لیے ہو کوئی بھی محکمہ ہو جب اس کے قوانین اور دستور العمل کو قبول کرلیا جائے تو اس کو ہر حال میں عمل کرنا ہی ہوگا یہ نہیں ہوسکتا کہ قانون تو قبول کرلے لیکن اگر وہ قانون اس کے نقصان کا باعث ہو تو اس پر عمل نہ کرے اور اپنے نفع نقصان کے بارے میں سوچے اس طرح تو وہ نظام محکمہ چل ہی نہیں پائے گا اور اس محکمہ کا دیوالیہ نکل جائے گا جب تک قانون قانون بنانے والے کی نظر میں مقید ہے سب لوگ اس کی اطاعت کریں یہاں تک کہ اگر اس قانون میں کوئی خامی ہو تو اس کی تلافی کرنا قانون گذار کی ذمہ داری ہے، اور دوسروں کو قانون میں خامی کا بہانہ بنا کر اور اس پر عمل کرنے سے فرار کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

9۔ حاکمیت اور انسان کے خلیفۃ اللّٰہی عظمت کے درمیان تعارض ایک شبہ

ایک دوسرا شبہ یہ کہا جاتا ہے کہ انسان قرآن کے مطابق خلیفۃ اللہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان روئے زمین پر خدا کا جانشین ہے اور خدا کی طرح عمل کرتا ہے جس طرح خدا نے اس دنیا کو خلق فرمایا ہے اس طرح انسان بھی بہت سی چیزوں کو پیدا کرے اور جس طرح خداوند عالم اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتا ہے تو انسان بھی جس کے اختیار میں زمین ہے وہ بھی اپنی مرضی کے مطابق عمل کرے۔

اعتراض کا جواب

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ پہلے خلافت الٰہی کے معنی صحیح طرح سے سمجھ لیے جائیں اور توجہ رہے کہ جس معنی میں حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ اللہ کہا گیا ہے

خداوند عالم اس سلسلہ میں ارشاد فرماتا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاۗءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ [1]

"یاد کیجئے اس وقت کو جب آپ کے پروردگار نے ملائکہ سے کہا میں روئے زمین پر جانشین (نمائندہ) بنانے والا ہوں تو اس وقت فرشتوں نے کہا کیا تو ایسے کو خلیفہ اور جانشین بنائے گا جو زمین پر خونریزی وفساد برپا کرے ہم تیری تسبیح وتحلیل کرتے ہیں تب اس وقت خداوند عالم نے فرمایا جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے"

یہ مقام تمام اولاد آدم کے لئے نہیں ہے کیوں کہ قرآن بعض اولاد آدم کو شیطان کہتا ہے ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۳۰

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ۔ [1]

"اور (اے رسول) جس طرح یہ کفار تمہارے دشمن ہیں اسی طرح (گویا) ہم نے (خود آزمائش کے لئے) شریر آدمیوں اور جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا" اس میں کوئی شک نہیں کہ شیطان ان افراد میں نہیں ہے کہ جس کو ملائکہ سجدہ کرتے اس موقعہ پر خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾۔ [2]

"اور (اے رسول وہ وقت یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک آدمی کو خمیر دی ہوئی مٹی سے جو سوکہ کر کہن کہن بولنے لگے پیدا کرنے والا ہوں تو جس وقت میں اس کو ہر طرح سے درست کر چکوں اور اس میں اپنی (طرف سے) روح پھونک دوں تو سب کے سب اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑنا"

خلیفۃ اللہ ہونا بہت سے اہم شرائط رکھتا ہے جن میں سے کچھ شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ اسماء کا علم

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ [3]

"اور (آدم کی حقیقت ظاہر کرنے کی غرض سے) آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے"

2۔ اللہ کا خلیفہ روئے زمین پر عدالت وانصاف کو جاری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو

لہٰذا وہ انسان جس کی عادت قتل وغارت اور خونریزی ہو اور کوئی بھی ظلم کرنے سے نہ گھبراتا ہو وہ خلیفہ اللہ نہیں ہوسکتا (معاذ اللہ) کیا خداوند عالم ظالم ہے کہ اس کا خلیفہ اور جانشین بھی ظالم ہو؟ اللہ کا خلیفہ وہ ہے جو اپنی فردی اور اجتماعی زندگی میں خدائی حفاظت کا اظہار کرے نہ یہ کہ جو دو پیروں سے انسانی شکل میں چلتا ہو وہ خلیفۃ اللہ ہے لہٰذا وہ افراد جو لوگوں کو گمراہ کرنے اور حکومت اسلامی کو درہم وبرہم کرنے میں لگا ہو وہ افراد نہ یہ کہ اشرف المخلوقات نہیں ہیں بلکہ انسانی شکل میں شیطان ہیں جن کو خداوند عالم حیوانوں سے بھی بدتر کہتا ہے ان لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ۔ [4]

"اس میں شک نہیں کہ زمین پر چلنے والے تمام حیوانات سے بدتر خدا کے نزدیک وہ بھرے گونگے (کفار) ہیں

---

[1] سورہ انعام؛ آیت ۱۱۲

[2] سورہ حجر آیات ۲۸، ۲۹

[3] سورہ بقرہ آیت ۳۱

[4] سورہ انفال آیت ۲۲

جو کچھ نہیں سمجھتے"

معترض کہتا ہے کہ انسان کی عظمت و بزرگی اس کے کردار سے ہے اور جو چیزیں انسان کی آزادی میں مانع ہوں وہ قابل قبول نہیں ہے یہ ایک دھوکہ والا نعرہ ہے جو مغرب زمین میں لگایا جاتا ہے اور دوسرے ملکوں میں بھی اسے قبول کیا جاتا ہے جبکہ اس کے لوازمات اور اثرات پر توجہ نہیں کی جاتی اور نعرہ پر پافشاری کی جاتی ہے بے شک اس نعرہ کے جواب میں کہ جس میں بہت سے اغراض و مقاصد پوشیدہ ہیں ایک تفصیلی بحث کی ضرورت ہے اور انشاء اللہ بعد میں اس سلسلہ میں بحث کی جائے گی لیکن اس وقت اجمالی طور پر یہ سوال کرتے ہیں کہ انسان کے مطلق طور پر آزاد ہونے کا مقصد کیا ہے اور کسی محدودیت کے قائل نہ ہونے سے آپ کی مراد کیا ہے؟ کیا آپ کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے لئے کوئی بھی قانون ضروری نہیں ہے؟

اس کو تو کوئی بھی عاقل انسان قبول نہیں کرسکتا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر کام میں آزاد ہے اور جو آزاد ہے وہ کسی کو قتل بھی کرسکتا ہے کسی کی عزت بھی لوٹ سکتا ہے لوگوں میں بدامنی بھی پھیلا سکتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ سب سے نقصان یا ضرر خود اس نظریہ رکھنے والے کو پہنچ سکتا ہے اور کیا ایسی آزادی رکھنے والوں کے درمیان زندگی بسر کی جاسکتی ہے؟ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کی آزادی نامحدود نہیں ہے اور اور انسان ایسا آزاد نہیں ہے کہ جو بھی چاہے اسے انجام دے اب جبکہ روشن ہو چکا ہے کہ آزادی محدود اور مشروط ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزادی کی حدود کو کون معین کرے؟ اور آزادی کی حد کہاں تک ہے؟

اور اگر طے یہ ہو کہ ہر انسان آزادی کی حد کو معین کرے تو اس کا نتیجہ بھی آپ کے سامنے ہے کہ ہر انسان اپنی مرضی سے عمل کرے اور یہاں پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جو مطلق آزادی پر ہوتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ آزادی کی حد کو معین کرنے کے لئے ایک قانونی مرجع ہونا چاہئے اس صورت میں اگر کوئی قبول کرتا ہے کہ خدا ہے اور انسان کے لئے نفع و نقصان کو خود اس سے بہتر جانتا ہے اور انسان کی زندگی سے خدا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہے اور وہ تو صرف اپنے بندوں کی بھلائی چاہتا ہے تو ایسے شخص کے لئے آزادی کی حد کو بیان کرنے کے لئے خدا کے علاوہ دوسرا کون ہوسکتا ہے؟ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے اعتقادی اور فکری مسائل میں کوئی تناقض نہیں ہے کیونکہ مسلمان اس خدا کو مانتے ہیں کہ جو انسان کے لیئے نفع و نقصان کو خود اس سے بہتر جانتا ہے اور بہتر طور پر جانتا ہے کہ انسان کی بھلائی کس چیز میں ہے لہٰذا وہ اس آزادی کی حد کو بیان کرے لیکن اگر کوئی خدا پر ایمان نہ رکھتا ہو یا اگر خدا پر ایمان تو ہو لیکن اس کو آزادی کی حد معین کرنے والا نہ مانے اور یہ کہے کہ انسان خود آزادی کی حد کو معین کرسکتا ہے تو ایسی صورت میں ہزاروں مصیبتوں میں مبتلا ہو جائے گا کیونکہ تمام انسان ایک نظریہ پر متفق نہیں ہو پائیں گے اور اگر اکثریت نے آزادی کی حد کو معین کیا اور اقلیت نے اس کو قبول نہ کیا وہ کس طرح اپنے حقوق تک پہنچ سکتے ہیں لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ اگرچہ آزادی ایک خوبصورت اور دل پذیر لفظ ہے لیکن مطلق اور لامحدود نہیں ہے اور کوئی بھی مطلق آزادی کو قبول نہیں کرسکتا۔

چھٹی نشست

اسلام میں آزادی

(دوسرا حصہ)

1-تاریخ انسان میں تحویل وتحول کی بنا پر ایک شبہ

یہ شبہ انسانی تاریخ، تمدن اور کلچر کے تحول وتبدل نیز اجتماعی نظام میں تغییر وتبدیلی کی بنا پر ہوتا ہے، اور یہ طے شدہ بات ہے کہ انسانی اجتماعی زندگی مختلف مرحلوں سے گذری ہے، اور ایک زمانہ میں "غلامی" کا مسئلہ رائج تھا، اور انسانی کی ترقی اسی میں سمجھی جاتی تھی کہ کمزور اور ناتوان لوگ دوسروں کی غلامی کریں، اور ان کی ہر ممکن خدمتگذاری کرتے رہیں، ظاہر سی بات ہے کہ اس زمانے میں انسان وخدا جیسا غلام اور آقا کے درمیان ہوتا تھا، کیونکہ اس زمانے میں یہ رائج تھا کہ بعض طاقتور لوگ مولا اور آقا اور بعض کمزور لوگ ان کے بندے اور غلام بن کر رہیں، اور انسانوں کے درمیاں رابطہ بھی عبد اور آقا کے لحاظ سے سمجھا جاتا تھا، اس بنا پر جس طرح ضعیف اور کمزور لوگ عبد اور بندے اور ذلیل وپست سمجھے جاتے تھے، اس طرح لوگ خدا کے عبد اور بندے سمجھے جاتے تھے، اور خداوند ان کا مولا وآقا، آج جب بندگی اور غلامی کا دور ختم ہو چکا ہے، لہٰذا اس وقت کا قیاس اور معیار اس زمانے میں نہیں لانا چاہئے۔

آج انسان کسی بھی زبردستی کو قبول نہیں کرتا، اور اپنے کو آقا سمجھتا ہے نہ کہ بندہ، لہٰذا ہمیں یہ نہیں کہنا چاہئے کہ ہم بندہ ہیں اور خدا مولا، آج ہم خود کو اللہ کا خلیفہ مانیں، اور جو خدا کا جانشین ہو اس کو بندگی کا احساس کیسا، گویا خداوند عالم سے خدائی ختم ہو چکی ہے اور یہ حضرت اس کی مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں، اور جو چاہیں کریں جس طرح کوئی حاکم کسی کو اپنا قائم مقام بنائے تو وہ اس کے تمام اختیارات کا مالک بن جاتا ہے، اور اس کے کام کے کام ہوتے ہیں اور ان کے درمیان حاکم وفرمانبردار کا رابطہ نہیں ہے، اور قائم مقام کے کاموں کی کوئی باز پرس نہیں ہونا چاہئے۔

اس زمانہ میں جبکہ ماڈرن اور جدید تمدن کا دور دورا ہے، اور ہماری زندگی ایک بلند مرتبہ پر پہنچ چکی ہے تو ہم بندگی اور غلامی کی زندگی کے احکام (اطاعت وفرمانبرداری) کو قبول نہیں کر سکتے، اور آقا ومولیٰ کے پیچھے پیچھے گھومتے رہیں، تکلیف اور اطاعت کا زمانہ پیچھے رہ گیا ہے، اور اگر قرآن میں تکالیف اور دوسرے فرمان موجود ہیں تو وہ غلامی کے زمانے کے ہیں، کیونکہ جس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے، غلامی کا زمانہ تھا، اور اسلام کا پہلا دور، خدا ورسول اور لوگوں کے درمیان

رابطہ کیلئے مناسب تھا۔

کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ انسان تکلیف کا طالب نہیں ہے، لیکن حقوق کا طالب ہے اور اس کے ذہن میں کبھی یہ نہیں آتا کہ اس پر کوئی فریضہ اور ذمہ داری ہے، تاکہ ان کو انجام دے سکے، انسان کو چاہئے کہ وہ خدا اور دوسروں سے اپنے حقوق کو حاصل کرے۔

خلاصہ یہ کہ جو لوگ پیغمبر، آئمہ اور ان کے جانشینوں کی اطاعت کا دم بھرتے ہیں یہ چودہ صدی پہلے کسی اجتماعی زندگی کا تھا، جبکہ آج کی اجتماعی زندگی بالکل بدل چکی ہے، اور فرائض اور ذمہ داری کی کوئی بات نہیں کرتا بلکہ انسانی حقوق کی باتیں ہوتی ہیں، انسان کو یہ سمجھانا ضروری ہے کہ تجھے یہ حق ہے کہ جس طرح بھی چاہے زندگی کرے، تجھے اپنی مرضی کے مطابق کپڑے پھننے کا حق ہے، اور جس طرح بھی چاہے اجتماعی زندگی کو بسر کرے۔

2- ہمارا جواب

ہم مذکورہ اعتراض کا جواب "تکوینی" اور "تشریعی" لحاظ سے پیش کرتے ہیں، کیونکہ ہمارے سامنے دو مقام ہیں: تکوینی مقام، تشریعی مقام، بہ عبارت دیگر مقام واقعیت اور "ھست ھا" (ہے) اور دوسرے مقام تکلیف "بایدھا" (ہونا چاہئے) یعنی عالم واقعیات، اور عالم ارزشہا (قیمت اور اہمیت) (اگرچہ مذکورہ الفاظ کے ایک ہی معنی ہیں، البتہ مختلف لوگوں کو سمجھانے کیلئے مختلف الفاظ ہیں) اب ہمیں یہاں دیکھنا ہے کہ تکوینی لحاظ سے ہماری خدا سے کیا نسبت ہے، کیونکہ اگر کوئی خدا کو مانتا ہی نہ ہو، تو اس کی نظر میں خدا سے کوئی نسبت بے فائدہ ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص خدا پر اعتقاد رکھتا ہو یا کم سے کم یہ قبول کرتا ہو کہ اس کا پیدا کیا ہوا ہے، اور خدا کی خالقیت کو قبول کرتا ہے (خدا کو ماننے کا یہ سب سے کم درجہ ہے) اور اپنے کو خدا کی مخلوق جانتا ہو، البتہ خدا کی خالقیت پر اعتقاد رکھنے سے انسان موحد (خدا کو ایک ماننے والا) نہیں بنتا، لہٰذا خدا کی تکوینی اور تشریعی ربوبیت کا قائل ہونا ضروری ہے، توحید در خالقیت کی بنا پر کسی کا یہ کہنا کہ وہ خدا کا بندہ اور اس کا مملوک نہیں ہے خود اس کے خداوند عالم کی خالقیت کے اعتقاد سے ٹکراتا ہے، توحید کا پہلا قدم اپنے کو خدا کی مخلوق تسلیم کرنا ہے، اور ہمارا وجود خدا کا عطا کردہ ہے، اور یہ وہی عبودیت ہے، عبد یعنی مملوک، دوسری کی ملکیت ہونا، لہٰذا اگر کوئی اپنے کو مسلمان اور خدا کا معتقد کہلاتا ہے، لیکن اپنے کو خدا کی عبودیت اور مملوکیت نہیں مانتا، گویا اس کی گفتگو میں واضح تناقض ہے، کیونکہ خدا پر اعتقاد ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ ہم خود کو اس کی مخلوق، عبد اور مملوک سمجھیں، اس وجہ سے تمام مسلمان اپنی بہترین عبادت نماز میں کہتے ہیں "اشھد انّ محمداً عبدہ ورسولہ" اور یہ بات مسلّم ہے کہ انسان کیلئے سب بہترین عظمت اور مقام خدا کا بندہ ہونا ہے، اس وجہ سے خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا۔ [1]

---

[1] بنی اسرائیل آیت ۱

"وہ خدا (ہر عیب سے) پاک و پاکیزہ ہے جس نے اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (آسمانی مسجد) تک کی سیر کرائی"

جی ہاں! خدا کی بندگی اور اس کی عبودیت کی اہمیت کے پیش نظر قرآن میں اس خوبصورت لفظ "عبد" اور اس کے دوسرے مشتقات کو استعمال کیا گیا ہے، اور انسان کیلئے بہترین اور بلند درجہ کو "عبودیت" شمار کیا گیا ہے:

يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ﴿٢٩﴾ [1]

"(اور کچھ لوگوں سے کہے گا) اے اطمینان پانے والی جان اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آ تو اس سے خوش ہے وہ تجھ سے راضی ہے تو میرے (خاص بندوں میں شامل ہو جا"

تشریعی لحاظ سے دوسرا جواب

دوسرا جواب تشریعی لحاظ سے یہ ہے کہ انسان کا آزاد ہونا اور قانون ذمہ داری قبول کرنا آپس میں سازگار نہیں ہے کہ جس کا نتیجہ وحشت، ظلم و بربریت اور عسر و حرج ہے، اور یہ نتیجہ نکالنا کہ انسان آزاد ہے جس طرح چاہے عمل کر سکتا ہے، اگرچہ اس نے اس قانون کو ووٹ دیا ہو لیکن اس پر عمل کرنے سے انکار کرے، ایسا تو جنگل میں بھی نہیں ہوتا کیونکہ وہاں پر بھی حیوانوں کے عمل کرنے کے لئے خاص قوانین ہوتے ہیں۔

لہٰذا جب ہم تمدن اور مدنیت کا دم بھرتے ہیں تو ہمیں قبول کرنا پڑے گا کہ مدنیت کا سب سے پہلا رکن یہ ہے کہ انسان قوانین پر عمل کرنے کا ذمہ دار ہے، اور ذمہ داری اور مسئولیت کو قبول نہ کرنے سے نہ صرف یہ کہ تمدن جدید کا ادعا نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اپنے کو وحشی گری کی سب سے نیچی کھائی میں غلطاں پائیں گے۔

دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جائے کہ انسان کی فصل مقوم عقل ہے، اور عقل کا حکم یہ ہے کہ انسان ذمہ داری کو قبول کرے، اور خدا امور کو انجام دینے کا مکلف سمجھے اور بعض چیزوں سے پرہیز کرے، لہٰذا اگر کوئی محلہ اور سڑک پر اپنی مرضی کے مطابق کپڑے پھنے یا لوگوں کے سامنے برہنہ آئے اور جو بھی منہ میں آئے وہ کہتا پھرے، تو اس صورت میں کیا کوئی اس کو عاقل تصور کر سکتا ہے؟ یا اس کو وحشی اور دیوانہ کہا جائے گا؟ اور اگر کوئی اس سے سوال کرے کہ تم ایسے کام کیوں کرتے ہو؟ اب اگر اس کے جواب میں کہے کہ میں چونکہ آزاد ہوں اور آزادی مقوم انسان ہے، لہٰذا میں اپنی مرضی کے مطابق جو چاہوں کروں، تو کیا کوئی انسان اس کی ان باتوں کو قبول کر سکتا ہے؟

لہٰذا چونکہ انسان کی فصل مقوم عقل ہے، اور اس کا عقلی لازمہ یہ ہے کہ انسانی ذمہ داری اور قانون کو قبول کرے، کیونکہ اگر قانون نہ ہو تو مدنیت نہیں ہو سکتی، اور اگر مسئولیت اور ذمہ داری نہ ہو تو انسانیت بھی نہیں آ سکتی، انسان کے آزاد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان تکویناً انتخاب کی قدرت رکھتا ہے، نہ کہ تشریعاً قانون اور الزام آور اور امکانات کو قبول نہ

---

[1] سورۂ فجر آیت ۲۷ تا ۲۹

کرے، اور اپنی اجتماعی زندگی میں کسی حد وحدود کا قائل نہ ہو، پس نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کو یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ دین کی ولایت آزادی کے مخالف ہے کیونکہ انسان کی فصل مقوم آزادی ہے جس سے انسان کا خدا کا جانشین ہونا لازم آتا ہے۔!

3۔ گذشتہ اعتراض، ایک دوسرے لحاظ سے

بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ انسان کی زندگی میں مختلف طریقوں سے ترقی اور پیشرفت ہوتی ہے، اور جیسا کہ انسانی جدید تمدن میں نئے طریقہ کی نظریات اور تفکرات پیدا ہوئے ہیں، ایسی صورت میں دین کو انسانی حقوق بیان کرنے چاہئیں، نہ یہ کہ دین تکالیف اور الزام آور احکامات بیان کرے، گذشتہ زمانے میں چونکہ غلامی، بردگی اور ظلم وجور کا زمانہ تھا اور جو بھی ذمہ داری اور مسئولیت ان کو دی جاتی تھی وہ اس کو قبول کرتے تھے، لیکن آج وہ زمانہ نہیں ہے آج ہر انسان اپنے کو آقا سمجھتا ہے، آج انسان ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا بلکہ اپنے حقوق لینا چاہتا ہے۔

درحقیقت آج کا ماڈرن زمانہ ہمارے اور گذشتہ (غلامی اور بردگی کو قبول کرنے والے) لوگوں میں ایک بہت بڑی دیوار ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ آج ماڈرن انسان نے گذشتہ زمانے کی طرح ذمہ داری کو قبول کرنے کو بند کر دیا ہے، اور اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا ہے، آج تکالیف اور ذمہ داری کو قبول کرنے کی باتیں کرنا ماضی کی طرف پلٹتا ہے، آج کے اس زمانے نے جس میں حقوق بشر کا نعرہ لگایا جاتا ہے، ڈیموکراسی کی برکت سے انسان کو استثمار اور غلامی کی قید و بند سے آزاد کر دیا ہے، آج کا دور وہ دور ہے کہ جس میں جو ادایان تکالیف اور ذمہ داری کی باتیں کرتے ہیں ان کو بالائے طاق رکھ دیا جائے، اور حقوق بشر کا نعرہ لگانے والے دین کو تلاش کیا جاتا ہے۔

اعتراض کرنے والے اپنے ہدف اور مقصد تک پہنچنے کیلئے نیز سماج بالخصوص جوانوں کو اپنے طرف جذب کرنے کیلئے ایسی باتیں کرتے ہیں اور مختلف طریقوں کا سہارا لیتے ہیں اور اپنی باتوں کو خوبصورت و دلنشیں انداز اور مختلف طریقوں سے جاشنی لگا کر پیش کرتے ہیں، لیکن ہم ان بے ڈھنگے سوالوں کا صحیح انداز میں جواب پیش کرتے ہیں۔

4۔ ہمارا جواب

معترض کا مطلق طور پر یہ کہنا کہ آج کا انسان اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا ہے، تکالیف و ذمہ داری کا مطالبہ نہیں کرتا، یہ بات بیہودہ اور باطل ہے جیسا کہ فلاسفۂ حقوق بھی کہتے ھین! انسان اس وقت کسی چیز کا مستحق نہیں ہوتا جب تک وہ دوسروں کیلئے کوئی کام انجام نہ دے ے، مثال کے طور پر اگر شہری حضرات کو صاف وسالم ہوا میں رہنے کا حق ہے تو دوسرے لوگوں پر ذمہ داری ہے کہ وہ ہوا کو آلودہ اور خراب نہ کریں، پر دوشن نہ پھیلائیں، اس طرح اگر کسی کو اپنے مال میں تصرف کا حق ہے تو دوسروں پر ذمہ داری ہے کہ اس کے مال میں دست درازی نہ کریں، ورنہ اپنے مال سے کوئی بھی بہرہ مند نہیں ہوسکتا، لہٰذا اگر اس کے لئے کوئی حق ثابت ہوتا ہے تو وہ اس کے بدلہ کوئی کام انجام دے، اگر کسی کو یہ حق ہے کہ وہ سماج کی تیار کردہ چیزوں کو استعمال کرے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ بھی کسی طریقہ سے سماج کی خدمت کرے، اور مسئولیت و ذمہ داری کو قبول کرے،

اور دوسروں پر بار نہ بنے، لہٰذا حق اور تکلیف ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں، لہٰذا یہ کہنا کہ انسان صرف حقوق کا طالب ہو، اور تکالیف کو قبول نہ کرتا ہو، یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔

توجہ رکھنا چاہئے کہ الٰہی اور غیر الٰہی تمام دانشمندان اور فلاسفۂ حقوق نے کلی طور پر ذمہ داری اور مسئولیت کی نفی نہیں کی ہے، بلکہ تکالیف اور ذمہ داری پر یقین رکھتے ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ معترض کی تکلیف سے مراد الٰہی تکلیف ہے، جس کا نچوڑ یہ ہے کہ خداوند عالم کو ہم پر تکلیف و ذمہ داری نہیں کرنا چاہئے، ورنہ تو ان کی نظر میں حق کے مقابلہ میں تکلیف ہونے سے گریز ناممکن ہے کیونکہ تکالیف کو تمام عقلاء اور دانشمندوں نے قبول کیا ہے ہماری بات کی تائید یہ ہے کہ خود انہوں نے صاف صاف کہا ہے کہ عبد اور مولیٰ کے درمیان رابطہ اور مولیٰ کی طرف سے حکم صادر ہونا اور اس کی اطاعت کا ضروری ہونا غلامی اور بردگی کلچر کے مناسب ہے۔

5۔ خدا کی نافرمانی تاریخ کی نظر میں

صرف آج کا ماڈرن انسان ہی خدا کی اطاعت اور تکالیف سے فرار اختیار نہیں کرتا بلکہ تاریخ میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جنہوں نے شیطانی وسوسوں کی خاطر خدا کی نافرمانی اور قانون شکنی کی ہے، یہ کہنا کہ:

انسان حقوق کا طالب ہے تکالیف کا نہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ شروع ہی میں حضرت آدم علیہ السلام کے فرزند قابیل نے خدا کی معصیت کی اور کھلے عام تکالیف اور الٰہی قوانین سے سرپیچی کی، اور قانون شکنی کرتے ہوئے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر ڈالا۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ ۘ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ ۚ قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ ۖ قَالَ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ... [1]

"(اے رسول) تم ان لوگوں سے آدم کے دو بیٹوں (ہابیل وقابیل) کا سچا واقعہ بیان کردو کہ جب ان دونوں نے خدا کی بارگاہ میں نذر پیش کی تو ان میں سے ایک (ہابیل) کی (نذر تو) قبول ہوآئی اور دوسرے (قابیل) کی (نذر) نہ قبول ہوئی تو (مارے حسد کے ہابیل سے) کہنے لگا میں تجھے ضرور مار ڈالوں گا، اس نے جواب دیا کہ (بھائی اس میں اپنا کیا بس ہے) خدا تو صرف پرہیزگاروں کی (نذر) قبول کرتا ہے"

قرآن مجید میں پیغمبروں کے واقعات اس بات کی حکایت کرتے ہیں کہ اکثر لوگوں نے اپنے زمانے کے نبی کو جھٹلایا، اور نہ صرف یہ کہ ان کی بات پر لبیک نہیں کہا بلکہ ان پر تہمت و بہتان لگاتے تھے اور ان کا مسخرہ کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کو قتل بھی کردیتے تھے، یا ان کو شہر بدر کردیتے تھے اگر کوئی نبی ان کیلئے مفید باتیں بیان کرتا تھا، مثلاً قرآن کے مطابق لوگوں کو کم فروشی سے روکتا تھا، جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] سورۂ مائدہ آیت ۲۷

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ ... [1]

"اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو" ان کے جواب میں کہتے تھے:

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ... [2]

"وہ لوگ کہنے لگے اے شعیب کیا تمہاری نماز (جسے تم پڑھا کرتے ہو) تمہیں یہ سکھاتی ہے کہ جن (بتوں) کی پرستش ہمارے دادا کرتے آئے ہیں انہیں ہم چھوڑ بیٹھیں، یا ہم اپنے مالوں میں جو کچھ چاہیں کر بیٹھیں"

ممکن ہے اس موقع پر کوئی کہے کہ تاریخ میں انبیاؑ و اولیاؑ الٰہی کے مقابلے کی وجہ بت پرستی، شرک اور شیطان کی پیروی تھی اور ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ انسان کسی بھی معبود کی اطاعت کی طوق اپنی گردن سے نکال دے، اور بتوں اور شیطان کی پیروی بھی نہ کرے، لیکن یہ کہنا بھی اولیاؑ الٰہی کی نظر میں باطل اور مردود ہے، کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وحی الٰہی کے مطابق انسان ایسے راستہ پر پہنچ جاتا ہے کہ یا خدا کی اطاعت کرے یا طاغوت (شیطان) کی اطاعت کرے، اور وہ کسی کی بھی اطاعت نہ کرے اس کے لئے محال، اور اگر کوئی یہ نعرہ لگائے کہ میں کسی کا بندہ اور غلام نہیں ہوں، درحقیقت ایسا شخص طاغوت اور اپنی ہوائے نفس کا غلام ہوتا ہے اس وجہ سے قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ... [3]

"خدا ان لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان لا چکے کہ انہیں (گمراہی کی) تاریکیوں سے نکال کر (ہدایت کی) روشنی میں لاتا ہے اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے سرپرست شیطان ہیں کہ ان کو (ایمان کی) روشنی سے نکال کر (کفر کی) تاریکیوں میں ڈال دیتے ہیں"

دوسری جگہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ ... [4]

"اے آدم کی اولاد کیا میں نے تمہارے پاس یہ حکم نہیں بھیجا تھا کہ (خبردار) شیطان کی پرستش نہ کرنا وہ یقینی طور پر تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے اور یہ کہ (دیکھو) صرف میری عبادت کرنا یہی (نجات کی) سیدھی راہ ہے"

---

[1] سورۂ شعراء آیت ۱۸۳

[2] سورۂ ہود آیت ۸۷

[3] سورۂ بقرہ آیت ۲۵۶

[4] سورہ یٰسین آیت ۶۰، ۶۱

اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر شیطان کی عبادت چھوڑی جائے تو پھر کسی دوسرے کی عبادت اور اطاعت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کو چاہئے کہ خدا کی عبادت کرے، جس طرح کہ کلمہ میں "لا الٰہ" کے بعد "الا اللہ" ہے۔

اس بنا پر جن لوگوں نے وحی پر توجہ کی اور خواب غفلت سے بیدار ہوئے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس خدا کی عبادت کریں جو ان کا خالق اور حقیقی مالک ہے، اور جس کے ہاتھ میں ان کی زندگی، موت، جوانی، پیری، اور صحت وسلامتی ہے، اس کی بندگی باعث افتخار ہے، اس کی تکالیف حکمت ورحمت کے سرچشمہ سے صادر ہوتی ہیں، اور ان پر عمل کرنا انسان کیلئے کمال اور سعادت کا باعث ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ تکالیف اور مسئولیت کو قبول نہ کرنا حیوانی درندگی صفت اور شیطانی پیروری کی وجہ سے ہے، کہ جو ہمیشہ تاریخ میں موجود ہے اور آج کے ماڈرن زمانے سے ہی مخصوص نہیں ہے، درحقیقت یہ ماڈرن انسان ہے کہ جس نے مدنیت سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے، اور جاہلیت ووحشی گری کے زمانے کی طرف پلٹ گیا ہے، اور گزشتہ زمانہ کی طرف پلٹ رہا ہے، وگرنہ انبیاء کی تربیت شدہ افراد نے حیوانیت اور وحشی گری سے کنارہ کشی کرلی ہے اور لاقانونیت سے نکل کر قانون، تکالیف اور مسئولیت کو قبول کر کے صحیح معنوں میں مدنیت کو قبول کر چکا ہے۔

لہٰذا بعض لوگ کس طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ ماڈرن زمانہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان کسی بھی ذمہ داری کو قبول نہ کرے! یہ تمدن ہے یا وحشیگری؟ تمدن ومحدویت، قانون اور مسئولیت قبول کرنے میں ہے ورنہ وحشی گری سے کوئی فرق نہ ہو گا۔

لہٰذا جو لوگ قانون، تکالیف اور مسئولیت کا انکار کرتے ہیں وہ لوگ مدیریت اور وحشی گری کے قدیم زمانے کی طرف پلٹنا چاہتے ہیں اور یہ طے ہے کہ کوئی شخص اس نظریہ کے تحت، مقدس اور خلیفہ اللہ نہیں ہوسکتا، جس سے وہ ہمارے لئے نمونہ عمل قرار پاسکے، (اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ مدنیت اور قانون کی طرف مائل ہونا جیسا کہ ہمارے سماج میں رواج پیدا کر چکا ہے، اس کا مطلب مدنیت اور قانون مندی کے کمال پر پہنچتا ہے تا کہ کسی بھی جگہ قانون کی خلاف ورزی نہ کی جائے، اور نہ ہی یہ کوئی نیا حادثہ ہوا ہے اور نہ ہی ہمارا سماج انقلاب کے بعد 19 سال تک وحشی گری کا شکار تھا اور آج مدنیت کی طرف مائل ہوا ہے، بلکہ ہمارا یہ انقلاب مدنیت اور اسلامی تمدن پر استوار ہے، اور انقلاب کے اصل اہداف میں سے ہے کہ تمام مقامات پر الٰہی قوانین کی رعایت کی جائے۔)

6۔ خدا کی اطاعت اور آزادی

انبیاء علیہم السلام لوگوں کو خدا پرستی کی دعوت دیتے تھے اور طاغوت کی پیروی سے روکتے تھے اس سلسلے میں خداوند عالم فرماتا ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ۔ [1]

"اور ہم نے تو ہر امت میں ایک (نہ ایک) رسول اس بات کے لئے ضرور بھیجا کہ لوگو خدا کی عبادت کرو اور بتوں (کی عبادت) سے بچے رہو"

اس چیز کے پیش نظر یہ بات قبول نہیں کی ہے کہ اسلام نے انسان کو اپنے علاوہ یہاں تک کہ خدا کی اطاعت سے بھی منع کر دیا ہے، اور یہ طے ہے کہ جو مذہب ہم کو خدا کی اطاعت کی دعوت نہ دے وہ باطل ہے اور جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا کہ انبیاؑ کا مقصد خدا کی مطلق طور پر اطاعت کرنے کی دعوت دیتا ہے، ہماری موت وحیات اسی سے وابستہ ہے

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ [2]

"ہم تو خدا ہی کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں"

ہم خدا کی طرف سے ہیں اور خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ اب جبکہ ہم نے خداوند عالم کو اپنا مالک حقیقی مان لیا تو پھر کس طرح یہ بات قبول کی جاسکتی ہے کہ خدا کو ہمیں حکم دینے اور فرمان صادر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، کیا مالکیت اس کے علاوہ ہے کہ مالک جس طرح بھی چاہے اپنی چیز میں تعریف کرے؟ لہٰذا یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ کوئی یہ کہے کہ ہم نے اسلام تو قبول کر لیا ہے لیکن ہم خدا کی بندگی کے قید و بند سے آزاد ہیں، کیونکہ اس طرح کی مطلق آزادی نہ صرف یہ کہ اسلام قبول نہیں کرتا، بلکہ اس کو تو عقل بھی قبول نہیں کرتی۔

اسلام آزادی کا نعرہ لگاتا ہے لیکن غیر خدا اور طاغوت کی عبادت واطاعت سے آزادی ورھائی کا نعرہ لگاتا ہے، خداوند عالم کی اطاعت سے آزادی کا نعرہ نہیں لگاتا، اگرچہ انسان آزاد ومختار پیدا کیا گیا ہے، لیکن تشریعاً وقانوناً خدا کی اطاعت پر مکلف ہے یعنی ہم اپنے ارادہ واختیار سے خدا کی اطاعت کریں، اور یہ طے ہے کہ خلقت کے اعتبار سے میں ہر مخلوق پر بندگی اور عبودیت کی مہر لگی ہوئی ہے، تکوینی طور پر کوئی بھی مخلوق خدا کی بندگی کے لیبل سے خالی نہیں ہے اور ہر موجود کی پستی اس کی عین بندگی ہے:

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ۔ [3]

"ساتوں آسمان اور زمین اور جو لوگ ان میں (سب) اس کی تسبیح کرتے ہیں اور (سارے جہان) میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے (حمد وثنا) کی تسبیح نہ کرتی ہو مگر تم لوگ ان کی تسبیح نہیں سمجھتے"

---

[1] سورۂ نحل آیت ۳۶

[2] سورہ بقرہ آیت ۱۵۶

[3] سورہ اسراء آیت ۴۴

اس طرح خداوند عالم دوسرے موجودات کی عبادت اور بندگی کے بارے میں فرماتا ہے:

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالطَّيۡرُ صٰٓفّٰتٍ‌ؕ كُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسۡبِيۡحَهٗ‌ؕ [1]

"(اے شخص) کیا تو نے اتنا بھی نہیں دیکھا کہ جتنی مخلوقات سارے آسمان اور زمین میں ہیں اور پرندے پر پھیلائے (غرض سب) اسی کی طرح تسبیح کیا کرتے ہیں، سب کے سب اپنی نماز اور اپنی تسبیح کا طریقہ خوب جانتے ہیں"

لیکن چونکہ انسان صاحبِ عقل وخرد ہے، مختار وآزاد خلق کیا گیا ہے، اگرچہ خداوند عالم نے ہدایت وگمراہی کے راستے دکھادیئے ہیں لیکن اپنے لئے راستہ کے انتخاب میں آزاد ہے جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّا هَدَيۡنٰهُ السَّبِيۡلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوۡرًا‌ [2]

"خواہ شکرگذار ہو خواہ ناشکرا"

لہٰذا انسان کو اپنے ہدفِ خلقت کو مدنظر رکھ کر اور اس کو سوچ سمجھ کر خدا کی اطاعت و بندگی میں مشغول رہنا چاہئے، اور خداوند عالم کا تشریعی قانون بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ شیطان اور غیر خدا کی اطاعت میں قدم بڑھائے، بلکہ انسان کو خدا کی اطاعت اور الٰہی تکالیف کو انجام دینا چاہئے، کیونکہ خداوند عالم نے اسی مقصد کے تحت اس کو پیدا کیا ہے:

وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡنِ [3]

"اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اسی غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں"

اور چونکہ خداوند عالم کی عبادت نظام خلقت وہستی کے ہمنوا ہے اور خداوند عالم کی تکالیف کو انجام دینا اور الٰہی وظیفہ و مسئولیت پر عمل کرنا نیز اس خالق کا شکر ادا کرنا خود ایک مہربانی ہے کہ جو ہم کو حیات وزندگی عطا کرتا ہے اور اس کی عنایت اور لطف وکرم سے ہم کو صحت وسلامتی اور دوسری بہت سی نعمتیں عطا کی گئی ہیں جیسا کہ خداوند عالم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی فرماتا ہے:

اَلَّذِىۡ خَلَقَنِىۡ فَهُوَ يَهۡدِيۡنِ ۙ﴿۷۸﴾ وَالَّذِىۡ هُوَ يُطۡعِمُنِىۡ وَيَسۡقِيۡنِ ۙ﴿۷۹﴾ وَاِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ يَشۡفِيۡنِ ۙ﴿۸۰﴾ وَالَّذِىۡ يُمِيۡتُنِىۡ ثُمَّ يُحۡيِيۡنِ ۙ﴿۸۱﴾ [4]

"جس نے مجھے پیدا کیا (وہی میرا دوست ہے) پھر وہی میری ہدایت کرتا اور وہ شخص جو مجھے (کھانا) کھلاتا ہے اور

---

[1] سورہ نور آیت ۴۱

[2] سورہ انسان آیت ۳

[3] سورہ ذاریات آیت ۵۶

[4] سورہ شعراء آیات ۷۸ تا ۸۱

مجھے (پانی) پلاتا ہے اور جب بیمار پڑتا ہوں تو وہی مجھے شفا عنایت فرماتا ہے اور وہ شخص جو مجھے ماڈالے گا اس کے بعد (پھر) مجھے زندہ کرے گا"

کس طرح خدا کی اطاعت سے انکار کیا جا سکتا ہے، اور کیا واقعاً یہ حق وانصاف سے بعید نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ اب ماڈرن انسان تکالیف واطاعت کا تابع نہیں ہے، اور اپنے حقوق کا طالب ہے؟

کیا اسلام اس فلسفہ کو قبول کر سکتا ہے؟ واقعاً ایسے نظریہ کا اسلامی ہونا تو دور کی بات، یہ تو عقل اور انسانیت سے بھی خالی ہے۔

ساتویں نشست

آزادی کی حدود

1- اسلام کا سیاسی نظریہ اور آزادی کو محدود کرنے کا شبہ

چونکہ ہمارا اسلامی سماج، اسلامی قوانین اور ان متغیر قوانین پر کہ جو اسلامی دائرے میں وضع کئے جاتے ہیں، ادارہ ہوتا ہے لہٰذا ہماری حکومت بھی اسلامی قوانین پر ہونی چاہئے اور قانون کو جاری کرنے والے حضرات اسلامی دائرے سے خارج نہیں ہونے چاہئے اور ہم لوگوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ اسلامی قوانین پر عمل کریں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ نظریہ انسان کی آزادی سے ہم آہنگ بھی ہے یا نہیں؟ انسان اپنی زندگی کے قوانین اور ان کی کیفیت کو طے کرنے میں آزاد ہے، اگر اس سے کہا جائے کہ تمہیں اس دائرے میں چلنا ہے اور ان قوانین کی رعایت کرنی چاہے تو کیا یہ انسان کی اصل آزادی جو انسان کی مسلمہ حقوق میں سے ہے، اس سے منافات تو نہیں رکھتا؟

ہم مندرجہ بالا سوال کو بیان کرنے سے پہلے مقدمہ کے طور پر اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اور اس نکتہ سے ہم کو بعد کی گفتگو میں اس سے استفادہ کرنا ہے، اور یہ نکتہ غور طلب ہے: جس وقت عینی اور انضمامی چیزوں سے ہمارا واسطہ ہوتا ہے، تو ان کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہوتا مثال کے طور پر جب ہم طبیعی علوم میں عینی چیزیں جیسے پانی، بجلی، اٹھنا، بیٹھنا، اسی طرح ڈاکٹری امور میں آنکھ، کان، ہاتھ، پیر، معدہ، دل، جگر کا مشاہدہ کرتے ہیں، تو ان چیزوں کو سمجھنا آسان ہے کیونکہ ہم تمام لوگ سمجھتے ہیں کہ ان الفاظ کے کیا معنی ہیں؟ ہاں بہت کم ایسے مسائل مبہم ہوتے ہیں جن کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے جیسے اگر پانی میں مٹی ملی ہو تو کیا پھر بھی پانی ہے یا نہیں؟

لیکن عینی اور انضمامی چیزوں کو سمجھنے میں غالباً کوئی خاص مشکل نہیں ہوتی، لیکن اگر ہمارے سامنے انتزاعی اور کسبی چیزیں ہوں (مثلاً فلسفی مفاہیم یا انسانی علوم مثلاً علم نفسیات، جامعہ شناسی، حقوق اور علوم سیاسی وغیرہ جیسی چیزیں) تو ان کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے، اور کبھی کبھی کسی لفظ کے مختلف معنی ہوتے ہیں اور ایک لفظ کے متعدد معنی ہونے کی وجہ سے ان کو سمجھنے میں مشکل ہوتی ہے غالباً ایسے الفاظ کے بارے بحث کے بعد بھی انسان کسی یقینی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔

مثال کے طور پر ہم سبھی لفظ، فرہنگ (کلچر) سے آشنا ہیں اور یہ لفظ مدارس کی مختلف کلاسوں میں استعمال ہوتا ہے، اسی طرح اشعار، ادبیات اور روزمرہ کی گفتگو میں استعمال ہوتا ہے، اس کے بعد بھی اگر کسی سے سوال کیا جائے کہ فرہنگ کے

کیا معنی ہیں؟ تو شاید ہزاروں میں ایک بھی ایسا شخص بھی نہ ملے جو فرہنگ کے معنی کرتے وقت کہے کہ اس لفظ کے 50 سے 500 تک معنی ہیں! اور یہ مسلم ہے کہ جب اس مشہور اصطلاح میں اتنا ابہام پایا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس ابہام کی وجہ سے بہت سے اجتماعی مسائل بھی تحت تاثیر قرار پائیں گے، اور جب توسعۂ فرہنگی (کلچر کی وسعت) کی بات کی جائے گی تو سوال کیا جائے گا توسعہ فرہنگی یعنی چیست؟ اور اس کے مصادیق کیا ہیں؟ اور کس صورت میں اور کس طرح فرہنگ میں توسعہ ہوتا ہے اور اگر پارلیمنٹ میں توسعہ فرہنگی کیلئے بجٹ پاس کیا جاتا ہے اور اس کو خرچ کرنے کیلئے جگھیں معین کی جاتی ہیں، ھر وزانتخانہ میں اس لفظ کے معنی بیان کئے جاتے ہیں اور اس کے خاص موارد مشخص کئے جاتے ھین اور بعض لوگوں کو اس سے غلط فائدہ اٹھانے کا موقعہ مل جاتا ہے۔

2-آزادی کے بارے میں مختلف نظریات

ہم نے جو کچھ انتزاعی اور کسبی الفاظ کے بارے میں عرض کیا کہ جن کے خاص مصادیق بھی نہیں ہیں اور ان کی تعریف وحدوحدود بھی مشکل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی ایک انتزاعی مفہوم ہے جس کے بارے میں ہمیں بحث کرنا ہے، مثلاً اگر کوئی کہے "آزادی" تو سننے والے کو اچھا لگتا ہے، اور آزادی کیلئے تمام ہی مذاھب، ملت خاص احترام کے قائل ہیں، کیونکہ انسان فطری طور پر آزادی چاہتا ہے، اور بعینہ آزادی کی تلاش میں رہتا ہے۔

اگر کسی انسان سے سوال کیا جائے کہ آپ آذادر ہنا پسند کرتے ہیں یا غلام؟ لامحالہ سبھی حضرات جواب دیں گے: آزادر ہنا، اور کوئی بھی شخص یہ نہیں چاہے گا کہ کسی کا غلام بن کر رہنا پسند نہیں کرے گا، لیکن چونکہ آزادی کے کوئی واضح معنی بیان نہیں ہوتے ہیں، جس کی بنا پر آزادی کا نعرہ لگانے والے افراد جو دینی اختلافات کا شکار ہوجاتے ہیں کوئی کچھ معنی کرتا ہے تو دوسرا کچھ معنی مراد لیتا ہے، ایک شخص جب آزادی کا مطلب بیان کرتا ہے تو دوسرا کہتا ہے ہماری نظر میں آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے جو آپ نے بیان کیا بلکہ اس کے معنی یہ ہیں جو ہم کرتے ہیں، اسی طرح دوسرا شخص بھی یہی کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ اس بارے میں جو کچھ اب ہماری طرف نسبت دیتے ہیں، وہ ہماری مراد نہیں ہے۔

بلکہ ہماری مراد اس کے علاوہ ہے اگر ہم آزادی کے بارے لکھی ہوئی کتابوں، مضامین اور رسالوں کا مطالعہ کریں خصوصاً وہ کتابیں جو آخری سالوں میں لکھی گئی ہیں تو ہمیں اندازہ ہوجائے گا کہ مولفین اور صاحب نظر حضرات کے دھیان آزادی کا کوئی مشخص ومعین معنی نہیں ہے، ایک شخص آزادی کا کچھ معنی کرتا ہے اور اسی کا دفاع بھی کرتا ہے، تو دوسرا شخص اس نظریہ کی تنقید کرتا ہوا ایک دوسرا معنی کرتا ہے، اور ظاہر میں بات ہے کہ اس قدر اختلاف کے باوجود آپس میں کوئی سمجھوتا نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا تفاہم اور سمجھوتے کیلئے آزادی کی ایک مشترک تعریف کی جانا ضروری ہے، تاکہ بحث کسی نتیجہ پر پہنچ سکے، اگر ہم سے کوئی سوال کرے کہ آزادی اور اسلام میں سازگاری ہے یا نہیں تو ہم اس کے جواب میں عرض کریں گے کہ پہلے ہمیں

آزادی کو سمجھنا پڑے گا، کہ آزادی کے معنی کیا ہیں، (اور جیسا کہ مغربی مولفین نے آزادی کے بارے میں حدوداً 200 تعریف بیان کی ہیں اگر چہ ان میں سے بہت سی تعریفیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں، صرف ایک یا دو الفاظ کی وجہ سے اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن ان مقامات پر یہ تعریفیں ایک دوسرے کے منافی (مخالف) ہیں تو اس طرح کے اختلافی موارد میں کس طرح یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ آزادی اسلام سے سازگار ہے یا نہیں؟

آزادی کی طرح "ڈیموکراسی" (جمہوریت) بھی ہے یہ ایک مغربی اصطلاح ہے جس کے معنی مردم سالاری، حکومت یا لوگوں کی حکومت کئے جاتے ہیں، لیکن پھر بھی اس کے کوئی خاص اور معین معنی موجود نہیں ہیں، اس میں یہ معین نہیں ہے کہ ڈیموکراسی ایک حکومت ہے یا اجتماعی زندگی کا ایک طریقہ ہے؟ کیا اس کا تعلق حکومتی اور سیاسی مسائل سے ہے؟ معاشرہ شناسی یا مدیریت سے اس کا ربط ہے؟ یہ جامعہ شناسی سے مربوط ہے یا اس کا ربط مدیریت سے ہے، اس سلسلے میں بھی بہت بحثیں ہوچکی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ ایسے الفاظ کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنا بھی مشکل میں اضافہ کرتا ہے۔

اس طرح لفظ "لیبرالیسم" بھی ہے کہ جس کا ترجمہ پہلے "آزادی خواہی" ہوتا تھا اور آزادی خواہی لفظ آزادی کی وجہ سے بہت جذّاب اور خاص اہمیت کا حامل تھا اور اس بنیاد پر آخری دھائیوں میں شاہ کی پہلوی حکومت "آزادی خواہ پارٹی" کا نام اپنائے ہوئے تھی۔

لہٰذا چونکہ اس طرح کے انتزاعی مفاہیم اچھی طرح واضح نہیں ہوتے ان سے بحث کرنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ واضح نہ ہونے کی بنا پر مطلب مشکل ہوجاتا ہے، اور قطعی طور پر ان کے معنی کی حد بیان کرنا مشکل ہوتا ہے اس طرح کے الفاظ کی کوئی خاص حد نہیں ہوتی، کبھی ان الفاظ کی حد کم ہوجاتی ہے اور کبھی بڑھ جاتی ہے اور ظاہری بات ہے کہ ان مشکلات کی وجہ سے بحث بھی پیچیدہ ہوجاتی ہے۔

لفظِ آزادی کے بارے میں ان مشکلات، ابہامات اور مختلف نظریات (جیسا کہ 200 سے زائد تعریفیں بیان کی گئی ہیں) کے پیش نظر اگر ہم اسلامی لحاظ سے آزادی کو سمجھیں اور الگ الگ تعریفوں کو اسلام کے ساتھ مقایسہ کریں تو واقعاً یہ ایک مشکل و پیچیدہ کام ہے، عمومی اور مختلف لوگوں کیلئے اس بحث کو بیان کرنا تو دور کی بات ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ بحث کو تطبیقی لحاظ سے آگے بڑھایا جائے اور دیکھیں کہ آزادی کے طرفدار حضرات آزادی سے کون سے معنی مراد لیتے ہیں؟ اور آزادی سے کیا چاہتے ہیں، اس وقت دیکھا جائے گا کہ جو وہ لوگ چاہتے ہیں وہ اسلامی نقطۂ نظر سے ٹھیک ہے یا نہیں؟ وہ لوگ جو آزادی چاہتے ہیں اور آزادی کی طرفداری بھی کرتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس ملک میں آزادی نہیں ہے، آزادی کا کیا مطلب مراد لیتے ہیں؟ کیا میڈیا آزاد نہیں ہے؟ کیا لوگ انفرادی آزادی نہیں رکھتے؟ یا سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی آزادی نہیں رکھتے؟ آزادی کا نعرہ لگانے والے لوگوں کو کس صورت میں آزاد سمجھتے ہیں؟

اگر مصادیق کے بارے میں تھوڑی بحث کی جائے تو ایک واضح نتیجہ پر پہنچنا ممکن ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا مدمقابل کیا کہتا ہے اور کیا چاہتا ہے، اس صورت میں گفتگو کی روش مبہم نہ رہے اور دوسرے افراد بھی اس سے غلط استفادہ نہ کرسکیں گے۔

3۔ آزادی، مطلق نہیں ہے، اور آزادی کے دین پر مقدم ہونے کا جواب

معمولاً خودغرض اور دھوکہ باز افراد آزادی جیسی انتزاعی اور مشکل چیزوں سے اپنے اہداف ومقاصد تک پہنچنے کیلئے آزادی جیسے الفاظ سے سوء استفادہ کرتے ہیں، اور اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والے کچھ سمجھتے ہیں جبکہ حقیقت میں ان کے کہنے کا مقصد فی کچھ اور ہی ہوتا ہے، مغالطہ آمیز اور دھوکہ دینے والے الفاظ کے ذریعہ لوگوں کو فریب دیتے ہیں، مثال کے طور پر تقریروں، مقالوں اور اخباروں میں یہ سوال بیان کیا جاتا ہے کہ دین آزادی پر مقدم ہے یا آزادی دین پر مقدم ہے؟ کیا اصل، آزادی ہے اور دین آزادی کے تابع ہے یا اصل دین ہے اور آزادی اس کے تابع ہے؟

معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں یہ سوال ایک علمی اور دقیق سوال ہے اور یہ سمجھنا واقعاً جذّاب ہے کہ آزادی اصل ہے یا دین اصل ہے؟ اس کا درک کرنا بڑی اہمیت کا حامل ہے، لیکن جب ہم بحث کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دین اصل ہے تو جواب دیتے ہیں کہ اگر کوئی آزاد نہ ہو تو کوئی پھر کس طرح دین کا انتخاب کرسکتا ہے؟ لہٰذا انسان کو دین قبول کرنے میں آزاد ہونا چاہئے،، پس نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی دین پر مقدم ہے اور جب یہ طے ہوجائے کہ آزادی دین پر مقدم ہے تو پھر یہ نتیجہ بھی آسانی سے نکل آئے گا کہ دین آزادی کو محدود نہیں کرسکتا، کیونکہ آزادی دین سے بالاتر ہے اور دین پر مقدم ہونے کا حق رکھتی ہے۔

قارئین کرام جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یہ مغالطہ آمیز استدلال ظاہراً تو ٹھیک دکھائی دیتا ہے، کیونکہ اگر کوئی انسان آزاد نہ ہو تو کس طرح دین کو انتخاب کرسکتا ہے، اس لئے انسان کو آزاد ہونا چاہئے، تاکہ اسلام کو دل سے قبول کرسکے، لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ آزادی دین پر مقدم ہے، اور یہی اصل ہے یہی دین کو معتبر بناتی ہے، اور بنیادی طور پر دین کی علت وجودی ہے لہٰذا اپنی پیدا کی ہوئی چیز کے ذریعہ خود ختم یا محدود نہیں ہوسکتی، آخر میں ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہر انسان کا دینی ماحول بالکل آزادی کے ساتھ ہوگا۔

بعض دوسرے افراد یہ استدلال کرتے ہیں کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو کسی کا غلام نہیں ہوتا بلکہ آزاد ہوتا ہے، لہٰذا زندگی اس کو میں آزاد ہونا چاہئے۔

اس طرح یہ بھی استدلال کرتے ہیں کہ اختیار اور آزاد ارادہ رکھنا ایک بہت اہم چیز ہے، اس بنیاد پر اگر انسان اس دنیا میں آئے اور اس کے ہاتھ پیر مفلوج ہوجائیں اور زبان سے گونگا ہوجائے تو اس کی کیا قیمت ہے؟ انسان کی قدر و قیمت اس وقت ہے جب وہ آزاد ہو جہاں چاہے جائے جو کرنا چاہے اس کو انجام دے سکے، جو چاہے اپنی زبان سے کہے اور چونکہ انسان تکوینی طور پر آزاد خلق ہوا ہے تو پھر قانونی طور پر بھی انسان کو آزاد ہونا چاہئے!

یہ وہی طبیعت گرانہ مغالطہ ہے کہ جس میں "است" (ھے) سے "باید" (ھونا چاہئے) کا غلط نتیجہ نکالا گیا ہے، اگر ہم چاہیں کہ ان تمام مسائل کو دقیق اور جدی طریقہ سے بحث کریں تو ہم کو فلسفی اور دقیق بحث کرنے کی ضرورت پیش آئے گی، اور بہت جلدی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اگر ہم آزادی کے بارے میں بحث کریں تو پھر دسیوں تعریفوں سے تحقیق و بررسی کرنی ہوگی، اس وجہ سے مصادیق کے سلسلے میں ہی بحث کرنا مناسب ہے، اور آزادی کا نعرہ لگانے والے افراد سے کہیں کہ: اگر کوئی شخص تمہارے منہ پر ایک زوردار تھپڑ لگا کر کہے میں آزاد ہوں؟! تو کیا یہ صحیح ہے؟ ظاہری بات ہے کہ جواب منفی ہوگا اور اس کو کوئی قبول نہیں کرے گا، اور جواب یہ ملے گا کہ آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے، کیونکہ یہ تو دوسروں پر ظلم ہے لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی اس وقت تک مناسب ہے کہ جب تک دوسرے پر ظلم وزیادتی نہ ہو، یعنی آزادی مطلق نہیں ہے۔

اور اگر اس سے یہ کہا جائے کہ کوئی شخص تمہارے خاندان اور عورتوں کے بارے میں جو کچھ چاہے کہے، وہ تم کو مار تو نہیں رہا ہے بلکہ آپ کی بے حرمتی کر رہا ہے اور تمہارے یا تمہارے اہل خانہ کے بارے میں نازیبا الفاظ کہہ رہا ہے، تو کیا یہ صحیح ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی اس بات کی اجازت نہیں دے گا، کیونکہ یہ بھی دوسروں کے حقوق کی پائمالی ہے، اور ناموس کی عزت بھی معاشرے میں محترم ہے، پس معلوم ہوا کہ عزت وناموس پر تجاوز وزیادتی ظاہری چیزوں پر منحصر نہیں ہے۔

اور اگر کوئی شخص کسی اخبار میں اس کے خلاف کچھ لکھے اور مقالہ کے ذریعہ اس کی شخصیت اور آبرو کو داغدار کرے، تو اس صورت میں کیا یہ فیزیکی اور ظاہری طور پر اس کی بے حرمتی نہیں ہوئی ہے، یعنی زبان کے ذریعہ اس کی بے عزتی نہیں ہوئی ہے، کیا کوئی اس چیز کی اجازت دے سکتا ہے؟ ہرگز کوئی شخص اس بات کو قبول نہیں کر سکتا، اور اس کام کو بھی دوسروں کے حقوق کی پائمالی اور اپنے لئے بے عزتی جانتا ہے، اور اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص اس کی آبروریزی کرے، اور اس کے حقوق کو پائمال کرے، نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی کیلئے اب تک تین قیود وشرط موجود ہیں اور اگر ان شرطوں کی رعایت نہ کی جائے تو دوسروں کے حقوق کی پامالی ہے۔

4۔ ہر معاشرے کی مقدسات کی رعایت ضروری ہے۔

ایک دوسرا نکتہ کہ جس کے بارے میں بحث کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہر معاشرہ کی مقدسات (قابل احترام چیزیں) الگ الگ ہیں، اور نسبی ہوتی ہیں مثال کے طور پر بعض معاشروں میں کسی کی بھن یا بیٹی سے آزادانہ رابطہ کرنا معیوب نہیں ہوتا، جیسا کہ یورپی اور امریکائی ممالک ہیں کہ کوئی بھی شخص کسی بھی لڑکی یا عورت سے دوستی کرنا چاہے، تو چاہے اس دوستی کے نتائج کچھ بھی نکلیں کوئی مشکل نہیں ہے۔

کیونکہ دونوں کی مرضی سے یہ کام ہو رہا ہے لیکن اگر کوئی شکایت کرے اور کورٹ میں جا کر اس کے خلاف مقدمہ دائر کرے کہ طاقت کے بل بوتے پر مجھ پر ظلم ہوا ہے اور میں راضی نہیں ہوں، تو عدالت اس کی اس شکایت کو سنتی ہے لیکن

صرف مرد وعورت کی دوستی کیونکہ اپنی مرضی سے ہوتی ہے، لہٰذا کوئی عیب نہیں ہے! لہٰذا اگر کوئی شخص کسی سے کہے میری اور تمہاری بھن کی دوستی ہے اور کل رات فلاں جگہ تھے یورپی فرہنگ وکلچر میں برا نہیں سمجھا جاتا، اور کوئی اس بات پر خوش بھی ہو سکتا ہے لیکن ہمارے معاشرے میں یہی بات بری سمجھی جاتی ہے اور اس کو برا سمجھا جاتا ہے کسی کو ایسی باتیں کہنے کا کوئی حق نہیں ہوتا، ان باتوں سے ایک دوسرا نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ ہر معاشرے میں کچھ خاص چیزیں ہوتی ہیں کہ جن کو وہ محترم اور مقدس سمجھتا ہے، درحالیکہ یہی چیزیں دوسرے معاشرے میں نہیں پائی جاتیں، اب یہ دیکھنا ہے کہ ان مقدسات کا معیار کیا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر معاشرے کی مقدسات اس کی ثقافتی اور اجتماعی زندگی کی وجہ سے ہوتی ہیں، اور ظاہری بات ہے کہ یہ مقدسات معاشرے کی بنیاد، اس ماحول اور ملک کے ثقافتی معیار کی وجہ سے ہوتی ہیں لہٰذا اگر کسی معاشرے میں وہاں کی ثقافت کے وجہ سے کچھ چیزیں مقدس اور قابل احترام ہوں، تو ان سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے اور ان کی بے احترامی نہیں ہونا چاہئے، اور کسی بھی معاشرے میں کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ جو چاہے کہے، جبکہ اس کو اس طرح کی باتیں کرنا چاہئے جن سے ان مقدسات کی بے احترامی نہ ہوتی ہو۔

نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی کیلئے بہت سی قید وشرط ہیں کہ جن کی ہر معاشرہ کے لحاظ سے رعایت کرنا چاہئے اور آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان جو چاہے کہے، اور جس طرح چاہے کرے، ہاں اگر جس ماحول میں وہ زبان کھول رہا ہے اسمیں اگر اس کو بے احترامی نہیں سمجھا جاتا تو اس کا کہنا صحیح ہے لیکن جس معاشرے میں وہ کہہ رہا ہے اگر وہاں اس کا یہ کہنا اس معاشرے اور مذہب کے مقدسات کی توہین ہے تو پھر کسی کو یہ حق نہیں ہے وہ مقدسات کے ہدف کچھ کئے، اور جو چاہے انجام دے اور کوئی بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا، اگر چہ ہم نے جو کچھ بیان کیا، مغربی ممالک میں محترم اور بااہمیت نہیں سمجھا جاتا اور ہر انسان اپنی گفتار وکردار میں آزاد ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں چونکہ اسلامی حکومت ہے مغربی ممالک سے فرق ہے اور اس طرح کی آزادی نہیں ہے کہ جو چاہے لوگوں کی طرف نسبت دے اس بات کی دلیل یہ ہے کہ ہمارے فرہنگ وماحول میں یہ چیزیں باارزش ہیں اور ہر قوم وملت کے مقدسات کا احترام کرنا ضروری ہے اور آزادی کے بہانہ ان کی خلاف ورزی کرنا صحیح نہیں ہے۔

پس معلوم یہ ہوا کہ آزادی کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ تصور کرتے ہیں اور اس قدر آزادی کو کوئی بھی عقلمند انسان قبول نہیں کرسکتا، لہٰذا آزادی کے اس طرح معنی بیان کرنے چاہئے ے جس سے دوسروں کی توہین اور ان کے حقوق کی پائمالی نہ ہوتی ہو۔

لہٰذا جن باتوں سے لوگوں کے مقدسات کی توہین ہوتی ہو ان کا بیان کرنا ممنوع اور ناجائز ہے، اسلامی معاشرہ میں آزادی کا بہانہ بنا کر خاص طور سے جان سے زیادہ عزیز اسلامی مقدسات کی توہین کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

ہماری قوم وملت نے ثابت کر دیا ہے کہ اپنے عزیزوں کی لاکھوں جانیں قربان ہوجائیں، لیکن اسلام باقی رہے،

اب اگر مغربی کلچر میں کسی بھی طریقہ سے کسی کی توہین ہو (مثلاً یہ کہا جائے کہ آپ کی ناک بہت لمبی ہے، آپ کا قیافہ برا ہے) اس کو عدالت میں جانے اور مقدمہ دائر کرنے کا حق ہے، اسی طرح اگر ہمارے معاشرے میں کوئی شخص کسی چیز کے بارے میں توہین کرے، وہ بھی اس بارے میں کہ جو ماں، باپ، بیوی اور اولاد حتی خود اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو، ظاہر ہے کہ لوگوں کو یہ اعتراض کرنے کا حق ہے کہ آزادی کا بہانہ بنا کر ہمارے مقدسات کی توہین کیوں کر رہے ہو۔

5-آزادی کے نعرہ میں ناجائز غرض

جو لوگ آزادی کا دم بھرتے ہیں اور آزادی نہ ہونے کا غم مناتے ہیں اور ایران میں آزادی نہ ہونے کا مرثیہ پڑھتے ہیں! کیا کہنا چاہتے ہیں؟ ان میں سے بعض لوگوں نے مغربی ممالک کا سفر کیا ہے یا ان کے بارے میں سنا ہے یا وہاں کی فلموں کو دیکھا ہے، جو لوگ اس طرح کی زندگی چاہتے ہیں، لیکن ایران میں ان کو اس طرح کی زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں ہے، اسلامی حکومت کہاں سے قوانین بناتی ہے؟ کیا اسلامی حکومت کے قوانین خدا، رسول اور آئمہ کی مرضی کے مطابق قوانین نہیں ہوتے ہیں؟ وہ لوگ الٰہی احکام کو قبول نہیں کرتے، ولی فقیہ پر اعتراضوں کی بوچھار کرتے ہیں اور ولی فقیہ کے متعلق کینہ رکھتے ہیں جبکہ ولی فقیہ اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کہتا:

فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ۔[1]

"یہ لوگ تم کو نہیں جھٹلاتے بلکہ (یہ) ظالم (حقیقتاً) خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں"

کیا مرجع تقلید اور فقیہ اپنی طرف سے کچھ کہتا ہے؟ وہ جو کچھ بھی کہتا ہے قرآن، احادیث سے اخذ کرتا ہے لیکن دشمن اس چیز کو قبول نہیں کرتا، امریکہ کی معتبر یونیورسٹیوں کی کھلی فضا میں بہت سے ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ لڑکے، لڑکیاں ایک دوسرے کے سامنے ایسے ایسے کام کرتے ہیں کہ جن کے بیان کرنے سے شرم آتی ہے، وہاں کے عیاش خانوں میں کیا کیا ہوتا ہے؟ تصور کریں اگر وہاں کے عیاش خانوں کی ویڈیو بنائی جائے اور اس کو اس ملت کے جوانوں کو دکھائی جائے تو اس کا کیا اثر ہوگا؟ اور ظاہر ہے کہ اگر کوئی جوان ایسی فلمیں دیکھے گا، اور جب صبح اٹھ کر یونیورسٹی جائے گا تو پھر سکون سے نہیں رہ سکے گا، کیونکہ رات میں سویا تھی نہیں ہے، اور دوسری طرف اس کی شہوت تحریک ہو جاتی ہے، اور اس کا چین وسکون غائب ہو جاتا ہے، اب اگر ایسا جوان نعرہ لگائے کہ یہاں آزادی نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو میں کرنا چاہتا ہوں، اس کو کرنے نہیں دیا جاتا اسلام کے مقابلہ میں اسی طرح کی آزادی کو لایا جاتا ہے۔

اور کہا جاتا ہے کہ آزادی مقدم ہے یا اسلام؟ اس آزادی کا مطلب ہی جنسی شہوات کو پورا کرنا ہے، لہٰذا شروع ہی سے یہ کہا جائے کہ آزادی سے ہم یہ چاہتے ہیں، ہر وہ چیز جو کچھ کفر والحاد کے ماحول میں ہوتی ہے وہی معاشرے میں بھی جائز ہو جائے تو وہ مطمئن رہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، کیونکہ لوگوں نے اپنے عزیزوں کی جانیں قربان کی ہیں تا کہ اسلام کا رواج

---

[1] سورۂ انعام آیت ۳۳

ہو، نہ کہ مغربی فساد اور بے ہودگی رائج ہو۔

ممکن ہے کہ کوئی یہ کہے کہ ہم واقعاً مسلمان ہیں اور اس حکومت کو ووٹ دیا ہے اور ولایت فقیہ کے معتقد ہیں اور جیسی آزادی مغربی ممالک میں رائج ہے ایسی آزادی نہیں چاہتے، بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہم لکھنا چاہیں اس کو بغیر کسی روک ٹوک کے بے جھجک لکھ سکیں ہم تو آزادی بیان وقلم اور عملی آزادی کے خواہاں ہیں، ہم کو اپنی بات کہنے کی آزادی ملنا چاہئے۔

یہ بات ظاہراً ٹھیک ہے کیونکہ حقوق بشر کے نشریات میں سے ایک حق جو تمام لوگوں کو ہے یہی آزادی بیان اور میڈیا کی آزادی ہے اور اسی طرح کی آزادی کو ڈیموکراسی کی ایک اصل مانا گیا ہے، لیکن ہم ان سے یہ کہیں گے کہ آپ اپنی رائے کا اظہار کریں کہ ہمارے ملک کے حکمران کیسے ہیں لیکن کیا واقعاً آپ کہنا چاہتے ہیں کہ فلاں شہر کا فلاں قاضی صحیح کام کرتا ہے یا نہیں یا فلاں شہر کا ڈی ایم (D-M) ٹھیک کام کرتا ہے یا نہیں یا فلاں ملازم کا کردار صحیح ہے یا نہیں؟ یا درحقیقت آپ اصل اسلام اور اسلامی مقدسات کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتے ہیں اور ان تمام چیزوں کی نفی کرنا چاہتے ہیں؟ یا اسلامی مقدسات کی توہین کرنا چاہتے ہیں؟

6۔ آزاد گفتگو کی حدوحدود

اگر آزادی سے آپ کی مراد یہ ہے کہ جس کام کا ہونا جائز نہیں ہے اس کے بارے میں لکھنا اور کہنا جائز ہونا چاہئے، جیسا کہ ہم نے مثال میں عرض کیا تو جب کسی شخص کو آپ کے سلسلے میں کوئی توہین آمیز کلمات کہنے کا کوئی حق نہیں ہے، یعنی وہ اتنی آزادی نہیں رکھتا لیکن جب اسلامی مقدسات کی بات آتی ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ آزادی بیان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم جو چاہیں لکھیں ہم جو چاہیں کہیں!

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اگر کوئی آپ کے بارے میں توہین آمیز کلمات زبان پر جاری کرے، اور اگر کوئی ایسا کرے تو آپ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور مقدمہ دائر کرنے کیلئے تیار ہوجاتے ہیں، آپ اجازت نہیں دیتے کہ آپ کے ذاتی مسائل کو اخبار میں دیا جائے تو پھر آپ کو اس ملت کے راز فاش کرنے کا حق کہاں سے حاصل ہوگیا؟ کس طرح آپ کی نظر میں کسی ایک شخص کے راز کو فاش کرنا جائز نہیں ہے، لیکن ایک ملت کے راز کو فاش کرنا جائز ہوگیا! یعنی آپ کی نظر میں جب ایک شخص لاکھوں میں تبدیل ہوجاتا ہے، تو کیا اس کے راز کو فاش کرنا جائز ہے؟! کیا ایک معاشرے کی نسبت اپنے مقالوں میں حدود کی رعایت کرنا ضروری نہیں ہے؟ کیا کچھ بھی لکھا اور کیا جاسکتا ہے، معاشرے کے بھی کچھ حقوق ہیں، اس کے مقدسات ہیں اور ان کا احترام باقی رہنا چاہئے اور مقدسات کو مجروح نہیں کیا جاسکتا۔

جس طرح آپ اپنی توہین کر برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں، اسی طرح آپ اپنی ناموس یا آپ کے گھریلو اسرار کے بارے میں تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتے، تو پھر آپ کس طرح اجازت دیتے ہیں کہ اس عظیم معاشرے جس

نے ہزاروں عزیزوں کو ان مقدسات کی حفاظت کیلئے قربان کر دیا ہے اس کی توہین کی اجازت دیتے ہیں؟!

کیا آپ کی نظر میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے، ؟اور آزادی کا بہانہ بنا کر قانون کی طرف سے کوئی حد وحدود نہیں ہونا چاہئے؟ کیا آزادی مطلق ہے؟ اور اگر آزادی مطلق ہو تو کسی کے بارے میں کچھ بھی کہنے کا حق حاصل ہونا چاہئے اور اگر اس 6 /کروڑ والی ملت کی مقدسات مجروح ہوں اور کوئی تم پر اعتراض کرے تو آپ جواب میں کہیں: اظہار نظر کرنا آزاد ہے! اس سے بڑا مغالطہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کے احترام کو مجروح کرنا جائز نہیں ہے لیکن 6 /کروڑ والی ملت کے مقدسات کو مجروح کرنا جائز ہے، لیکن ایک عرب مسلمانوں کے مقدسات کو مجروح کرنا جائز ہے! یہ کونسی منطق اور فلسفہ ہے؟ اور صرف اس وجہ سے کہ حقوق بشر کے نشریات میں موجود ہے کہ بیان آزاد ہے مقدسات کی توہین کرنا بھی آزاد ہوجائے گا؟! آزادی کا ایک مبہم کلمہ استعمال کرتے ہیں اور ہر شخص اپنے لحاظ سے اس کی تفسیر کر کے سوء استفادہ کرتا ہے۔

7- الفاظ کے مفہوم اور مصادیق کو روشن کرنے کی ضرورت

ہم یہاں پر یہ مشورہ نہیں دیتے ہیں کہ مبہم اور غیر واضح الفاظ کو استعمال کرنے کے بجائے ان کے مصادیق پر تکیہ کریں اور کہیں کہ یہ کام جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً یہ کہنے کے بجائے کہ اسلام ڈیموکراسی کے موافق ہے یا نہیں؟ کہیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں اور کون سا عمل انجام دینا چاہتے ہیں؟ کیا آپ خدا اور اس کے احکام کو نادیدہ کرنا چاہتے ہیں اس کی اسلام اجازت نہیں دیتا، اگر ڈیموکراسی کے یہ معنی کیے جائیں کہ انسان جس طرح کے قوانین بنانا چاہے بنا سکتا ہے اگر چہ خدا کے قوانین کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں، تو چاہے پوری دنیا زور لگائے ہرگز ہم ایسی ڈیموکراسی کو قبول نہیں کر سکتے۔

لیکن اگر ڈیموکراسی کے یہ معنی کئے جائیں کہ لوگ اپنی سرنوشت اور زندگی میں مؤثر ہیں، کوئی شخص اپنے زور کے ذریعہ ان پر تحمیل نہیں کر سکتا، افراد بھی اسلامی قوانین اور بنیادوں کے دائرے میں چلیں، تو اس چیز پر تو شروع انقلاب سے عمل ہو رہا ہے، اور اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ ایران کے برابر کسی بھی ملک میں لوگوں کی کا احترام نہیں کیا جاتا، تو شاید دعویٰ بے جا نہ ہو گا، اور شاید کہنے کی وجہ بھی یہ ہے کہ ہمارے پاس اس حد تک ثبوت نہیں ہیں، لیکن پھر بھی ہمارا نظریہ یہ ہے کہ دنیا میں کہیں بھی اتنی آزادی نہ ہو، لہٰذا لفظ ڈیموکراسی پر بحث ومباحثہ کرنا کہ اسلام ڈیموکراسی کا موافق ہے یا مخالف ہے؟

اس سے بہتر یہ ہے کہ پہلے اس کے مصادیق کو معین کر لیں، مثلاً کیا اسلام ہم جنس بازی کے آزاد ہونے کی اجازت دیتا ہے؟ چاہے تمام ہی لوگ ایسا نظریہ رکھتے ہوں، ظاہر ہے کہ اسلام اس چیز کی اجازت نہیں دیتا اگر تمام ہی لوگ اس چیز کے موافق ہی کیوں نہ ہوں اور اس بارے میں ووٹ بھی دیں، لہٰذا اگر ڈیموکراسی اس حد تک بے لگام ہو تو پھر ہم اس کو نہیں مانتے، لیکن اگر ڈیموکراسی سے مراد یہ ہو کہ افراد انتخابی مہم میں آزاد ہیں پارلیمنٹ کے ممبران کو آزادانہ طور پر منتخب کریں، صدر کا انتخاب آزادانہ طریقہ پر ہو اور ان کو حق ہے کہ ممبران پارلیمنٹ یا دوسرے ذمہ دار افراد سے کسی مسئلہ میں وضاحت مانگے تو ایسی آزادی ہونا چاہئے کہ الحمدللہ ہمارے یہاں یہ آزادی ہے، اور ہم بھی سو فیصد اس کی حمایت کرتے ہیں، لہٰذا اس کے لئے

الفاظ کی بحث میں جانے سے بہتر یہ ہے کہ ان کے مصادیق کے بارے میں بحث کی جائے، کھلے عام کہیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں تا کہ اس کا جواب بھی واضح طور پر دیا جا سکے۔

اور اگر الفاظ مبہم اور نامشخص استعمال کئے جائیں گے تو ان کے جوابات بھی مبہم دیئے جائیں گے، درج ذیل الفاظ جیسے آزادی، ڈیموکراسی، لیبرالیسم، جامعہ مدنی، تمدن اور فرہنگ وثقافت مبہم ہیں کہ جن کی مختلف تفسیریں کی جا سکتی ہیں لہٰذا ان کے بارے میں بحث ومباحثہ کرنا کبھی بھی عقلمندی نہیں ہے، صاف کہیں کیا چاہتے ہیں تا کہ ہم اس کا جواب دیں کہ آیا اسلام سے ہم آہنگ ہے یا نہیں؟